سات آسمان

سات کلاسیکی شاعروں کے ادبی خاکے

ڈاکٹر اسلم فرّخی

SAAT ASMAN
(Pen Porrtraits of Seven Classical Urdu Poets)
by
Dr. Aslam Farrukhi

اشاعت: ۲۰۱۱
صفحہ سازی: احمد گرافکس
مطبع: اے جی پرنٹنگ سروسز، کراچی

بی۔۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی
info@scheherzade.com
Website: www.scheherzade.com

انتساب

غزل

انوشہ

اور

دانیال کے لیے

فہرست

۷۸۶

حامداً و مصلیاً

O

کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بڑی اور اہم بن جاتی ہیں۔ اس مجموعے میں شامل سات شعرا کے خاکے بھی ایک چھوٹی سی بات سے وجود میں آئے اور پھر انھوں نے ایک مجموعے کی شکل اختیار کرلی۔

ہوا یہ کہ میں جس زمانے میں انجمن ترقی اردو پاکستان میں "مشیر علمی و ادبی" کے فرائض انجام دے رہا تھا، ایک دن انجمن کے صدر نورالحسن جعفری مرحوم نے مجھ سے کہا کہ برماشیل کے بعض افسروں اور دوسرے اداروں کے تعلیم یافتہ لوگوں کی خواہش ہے کہ اردو ادب بالخصوص شاعری سے شناسائی پیدا کی جائے۔ ان کے اجتماع میں ایسے مضامین پڑھے جائیں جو تنقیدی نہ ہوں، تعارفی ہوں۔ اچھے معلوماتی مضامین ہوں۔ میں نے کہا، یہ کیا مشکل ہے۔ ہر مہینے ایک جلسہ کر لیجیے۔ کسی شاعر کے بارے میں ایک ہلکا پھلکا تعارفی مضمون پڑھوا دیجیے۔ سوچتے رہے۔ بات کچھ سمجھ میں آئی، کچھ نہیں آئی۔ برماشیل کے افسر تقریبات اقبال کاظمی سے مشورہ کیا۔ اقبال کاظمی شاعر بھی اچھے اور منتظم بھی اچھے۔ طے ہوا کہ برماشیل کا سالانہ مشاعرہ اس دفعہ "بیادِ میر" ہوگا۔ شعراء میر کی کسی زمین میں غزل پڑھیں گے اور اسلم فرخی میر کے بارے میں تعارفی مضمون پڑھیں گے۔ چناں چہ مشاعرہ ہوا اور بہت سرسبز ہوا۔ مضمون کے انداز اور اسلوب کو بھی حاضرین نے بہت پسند کیا۔ پھر تو روایت پڑ گئی۔ خواجہ میر دردؔ، سودا، مصحفی، آتش سب کے حوالے سے مشاعرے ہوئے اور میں نے مضامین پڑھے۔ خیال تھا کہ مضامین کا پورا ایک مرقع تیار ہو جائے گا مگر برماشیل کا نظم و نسق انگریز کمپنی نے سنبھال لیا۔ جعفری صاحب کی چیئرمینی ختم ہوگئی۔ مشاعرے بھی ختم ہوگئے لیکن ان کی صدارت میں منعقد ہونے والے یہ

مشاعرے شہر میں ایک ایسی روایت کی حیثیت اختیار کر گئے جس کی خوشبو آج بھی محسوس ہوتی ہے۔

برسوں بعد پھر مشاعرے کا غلغلہ اُٹھا اور ایک مشاعرہ "بنامِ ذوق" منعقد کرنے کا اہتمام ہوا۔ تاریخ طے ہو گئی۔ دعوت نامے چلے گئے۔ خاکہ لکھ لیا گیا۔ کتابچے کی صورت میں چھپ بھی گیا لیکن بوجوہ مشاعرہ منعقد نہیں ہو سکا۔ یہ خاکہ انجمن ترقی اردو، دلّی کے رسالے "اردو ادب" میں شائع بھی ہو گیا۔ خاکوں کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اردو شاعری کے سات آسمانوں کے یہ خاکے ایک لفافے میں حفاظت سے رکھے رہ گئے۔ میں نے بارہا کوشش کی کہ کسی اور شاعر کا خاکہ بھی مرتب ہو جائے لیکن طبیعت اس طرف مائل نہیں ہوئی۔

اس مجموعے کی اشاعت آصف فرخی کی مرہونِ منت ہے۔ وہ مجھ سے ان کے بارے میں اکثر دریافت کرتے رہتے تھے اور آخرکار انہوں نے ان خاکوں کو شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے اصرار اور تقاضوں سے یہ مجموعہ مرتب ہوا ورنہ شاید یہ خاکے کسی بادامی لفافے میں بند پڑے رہتے۔ اب یہ مجموعہ آپ کے سامنے ہے۔ یہ کوئی تحقیقی تنقیدی یا علمی کارنامہ نہیں۔ من کی موج ہے۔ عام قاری کے لیے اردو کے سات آسمانوں کا مرقع ہے۔ شاید آپ کو پسند آئے۔

اسلم فرخی

میر تقی میر

علیم اللہ جب قاضی کے حوض پر کہ گزر گاہ خاص وعام ہے پہنچا، تو اُس جوان کو وہاں بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک گیا، جس کے چہرے سے مایوسی آنکھوں سے غم چین پیشانی سے کچھ خفّت کچھ جھنجھلاہٹ، لباس سے افلاس، حلیے سے اضمحلال اور طرزِ نشست سے لااُبالی انداز کا اظہار ہو رہا تھا۔ غور سے دیکھا تو جنون کی سی کیفیت، دیوانگی کا طور، مسکینی اور انانیت دونوں کا امتزاج۔ سراپا میں جس جا نظر کیجیے یہ محسوس ہوتا تھا کہ گردشِ روزگار کا مارا ہوا، حالات کی بے رحمی کا شکار، ایک افسردہ دل نوجوان ہے کہ تھک کر سرِ راہ ٹھہر گیا ہے۔ مگر اس انداز میں بھی ایک آن پائی جاتی ہے۔ ویسے تو سارا شاہ جہاں آباد ہی ان دنوں افسردگی اور اضمحلال کا شکار تھا مگر نوجوان کی افسردگی بطون سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ علیم اللہ لمحے بھر کے لیے ٹھٹکا اور پھر نوجوان کو پہچان گیا۔ وہ بڑے ادب سے اس کی طرف بڑھا۔ سلام کیا اور خیریت دریافت کی۔ نوجوان نے اسے غور سے دیکھا۔ سلام کا جواب دیا اور پھر پوچھا، ”بھائی تم مجھے کیسے پہچانتے ہو۔“ علیم اللہ نے جواب دیا، ”میر صاحب آپ کا سودائیانہ طرز تو سارے شہر میں مشہور ہے۔ آپ کو کون نہیں پہچانتا۔ مگر یہ سرِ راہ تشریف رکھنے کا کیا سبب ہے۔ آپ کا حقیقی مقام دلِ احباب ہے اور آپ رہ گزر پر بیٹھے ہیں۔“

علیم اللہ کا اتنا کہنا تھا کہ میر صاحب کی آنکھوں کے سامنے حرماں نصیبی کی پوری تصویر عیاں ہو گئی۔ والد کی بے بضاعتی اور درویشی، گھر کا درویشانہ ماحول، گیارہ برس کی عمر میں والد کے سائے سے محروم ہو جانا، سوتیلے بڑے بھائی کی بد سلوکی اور بے مہری، چھوٹے بھائی اور بہن کی کفالت، فکرِ معاش میں دلّی کا سفر، والد کے ایک عقیدت مند نواب صمصام الدولہ کی بارگاہ سے ایک روپیہ روز وظیفہ مقرر ہونا، حملۂ نادری میں صمصام الدولہ کا زخمی ہونا اور پھر اُن کا انتقال، وظیفہ کی بندش، بار دگر دلّی، سراج الدین علی خان آرزوؔ کے یہاں قیام، جنوں میں مبتلا ہونا، آرزو

کی شاگردی، اُن کے ایما سے شعر و شاعری کی مشق، سودائیانہ طور میں اضافہ، مہتاب میں ماہتابی شکل کا نظر آنا، عشق کا وفور، شہرتِ شاعری کا ظہور، دیوانگی کا چرچا، سخن والی کا شہرا پھر آرزو کی خفگی اور فہمائش کہ ایک نامور بزرگ اور پابند وضع انسان کی حیثیت سے یہ اُن کی ذمہ داری تھی۔ اپنی بے چارگی کا احساس، نازک مزاجی، معاشی الجھن اور پھر آج کا تازہ واقعہ کہ آرزو نے بھرے دستر خوان پر سب کی موجودگی میں نصیحت شروع کر دی۔ نصیحت یا فضیحت اور اپنا برافروختہ ہو کر دستر خوان سے اُٹھ آنا اور سر راہ بیٹھ جانا۔ سارے واقعات یکے بعد دیگرے آنکھوں کے سامنے پھر گئے مگر کہتے تو کیا:

صبر بھی کریے بلا پر میرؔ صاحب جی کبھو
جب نہ تب رونا ہی کڑھنا یہ بھی کوئی ڈھنگ ہے

علیم اللہ پاس ہی بیٹھ گیا اور اگلے دن غم زدہ میرؔ کو قمرالدین خان کے یہاں لے گیا جن کے توسط سے وہ میر رعایت خان کے متوسلین میں شامل ہو گئے۔ ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا۔

محمد تقی میرؔ کہ جنھیں اردو شاعری "خدائے سخن" کے لقب سے پہچانتی ہے، اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ درویشانہ ماحول میں آنکھ کھولی۔ والد محمد علی متقی خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ بیٹے کو یہی سمجھاتے تھے کہ بیٹا عشق اختیار کرو۔ یہی کائنات کا نور، تخلیق کا وفور اور انسان کا شعور ہے۔ ان کے انتقال سے میرؔ کے لیے مصائب و آلام کے دور کا آغاز ہو گیا۔ جوں توں زندگی گزاری۔ خانِ آرزوؔ نے ذہنی تربیت بھی کی۔ شعر و شاعری کی طرف متوجہ بھی کیا اور فن کے رموز و نکات بھی سمجھائے۔ جنوں، میرؔ کا خاندانی مرض تھا۔ ان کے ایک چچا اسی مرض کی نذر ہوئے تھے۔ میرؔ بھی اس میں مبتلا ہوئے۔ نوجوانی ہی میں زندگی نے پے بہ پے ایسے سبق سکھائے کہ میرؔ کو اعتراف کرنا پڑا:

زیرِ فلک بھلا تو رووے ہے آپ کو میرؔ
کس کس طرح کا عالم یاں خاک ہو گیا ہے

دور وہ تھا کہ ہر چیز بے نشان ہوئی جا رہی تھی۔ کیا عظیم الشان مغلیہ سلطنت۔ کیا شاہ جہاں آباد کی رونق اور آبادی۔ کیا اُمرا اور وزرا، کیا اہلِ حرفہ اور کیا لشکری، سب کے سب معدوم

ہوئے جا رہے تھے۔ ایک اضطراب تھا۔ عالم گیر بے چینی تھی۔ معاشی بدحالی تھی۔ اعتماد ختم ہو گیا تھا۔ سیاسی انتشار تھا۔ افغان، مرہٹے، جاٹ، روہیلے سبھی پایۂ تخت کو روندرہے تھے۔ میرؔ کی حساس طبیعت کو اس ماحول نے اور زیادہ حساس بنادیا۔ اندرونی ماحول اور بیرونی فضا دونوں نے میرؔ کی غم پسندی میں اضافہ کیا۔ وہ ساری زندگی اس کا اظہار کرتے رہے۔ آرزو سے علاحدہ ہو کر میر رعایت خان کے متوسلین میں شامل ہوئے۔ چاروناچار دن گزارے کہ طبیعت کی اُفتاد سے مجبور اور نازک مزاجی کی وجہ سے ظاہر بینوں کی نگاہ میں مغرور تھے۔ ایک شب کہ شبِ ماہ تھی ایک مُغنّی رعایت خان کے سامنے بیٹھا گا رہا تھا۔ میرؔ بھی موجود تھے۔ رعایت خان نے کہا، اس لڑکے کو اپنے چند شعر یاد کرادیجیے تاکہ یہ انھیں ساز پر گائے۔ وقار شعر کے علم بردار میر کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ اس لڑکے کو کچھ شعر تو لکھ کر دے دیے مگر دو تین دن بعد خانہ نشین ہو گئے۔ رعایت خان نے پھر بھی رعایت برتی کہ میر کی جگہ اُن کے چھوٹے بھائی کو ملازم رکھ لیا۔ ملازمت میں یہ طنطنہ میر ہی کے یہاں تھا کہ تم امیر ہو تو ہم بھی میر ملک سخن ہیں۔ تم سے کسی طرح کم نہیں۔

مجھ کو دماغِ وصفِ گل و یا سمن نہیں
میں جوں نسیم بادِ فروشِ چمن نہیں

مختلف اُمرا کی ملازمت میں رہے۔ راجا جُگل کشور، راجا ناگرمل، نواب بہادر جاوید خان۔ شعروشاعری بھی کی، سفارتی امور بھی انجام دیے۔ درباردار بھی رہے مگر:

زمانے نے رکھا مجھے متصل
پراگندہ روزی پراگندہ دل

امیروں کا حال کون سا اچھا تھا۔ جاوید خان قتل ہوئے، راجا جُگل کشور معاشی بدحالی کا شکار ہوا۔ ناگرمل سے میر خود علاحدہ ہوئے، عجیب افراتفری کا عالم تھا۔

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انھوں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

میر جب تک دلّی میں رہے شاہی دربار سے بھی کچھ نہ کچھ آتا رہتا تھا۔ لیکن شاہی دربار کیا، ایک درگاہ رہ گئی تھی جس کا تکیہ دار خود بادشاہ تھا۔ دلّی کے صاحبانِ کمال فضال کی اس بے یقینی

سے دل برداشتہ ہو کر شہر چھوڑے جا رہے تھے۔ استاد الاساتذہ سراج الدین علی خان آرزو لکھنؤ چلے گئے۔ مرزا محمد رفیع سودا کہ سر خیالِ شعرائے شاہ جہاں آباد تھے، لکھنؤ چلے گئے۔ میر سوز بھی لکھنؤ چلے گئے، دلّی اُجڑ رہی تھی، لکھنؤ آباد ہو رہا تھا کہ وہاں داخلی اور بیرونی کش مکش نہ تھی۔ جان و مال کا تحفظ تھا، در و دیوار سے شعر و نغمہ کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ آصف الدولہ کی داد و دہش سے گھر گھر دولت کی گنگا بہہ رہی تھی۔ نئی تراش خراش، نئی وضع، ایک نیا طرزِ احساس، ایک نیا تہذیبی مرکز وجود میں آ چکا تھا۔ سودا کا انتقال ہوا تو آصف الدولہ کو خیال ہوا کہ اگر میر لکھنؤ آ جائیں تو لکھنؤ کی شعری حیثیت نہ صرف برقرار رہے گی بلکہ اُس میں اضافہ بھی ہو گا۔ چناں چہ آصف الدولہ کے ایما سے نواب سالار جنگ نے زادِ راہ اور طلبی کا پروانہ بھجوا دیا۔ میر لکھنؤ کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستے میں فرخ آباد کے نواب نے انھیں صرف چھ دن کے لیے روکنا چاہا مگر میر ہوائے شوق میں اُڑ رہے تھے، رُکے نہیں۔ حسن افزا منزل کے مشاعرے میں "ہستی اپنی حباب کی سی ہے۔ یہ نمائش سراب کی سی ہے" پڑھ کر آگے بڑھ گئے اور لکھنؤ پہنچے۔ یہ واقعہ ۱۱۹۶ھ کا ہے، میر اس وقت ساٹھ برس کے ہو چکے تھے اور اب یہ راقم آثم کہ اردو ادب کے البیلے انشا پرداز مولوی محمد حسین آزاد کا سوانح نگار بھی ہے اور خوشہ چیں بھی، الفاظ کے رنگ و آہنگ اور تخئیل کی تجسیم کے اس باکمال مصور کے نگار خانے کی ایک تصویر آپ کی نذر کرتا ہے اور سلسلہ سخن کو یوں رونق دیتا ہے کہ "لکھنؤ میں پہنچ کر جیسا مسافروں کا دستور ہے ایک سرا میں اُترے۔ معلوم ہوا کہ آج یہاں ایک جگہ مشاعرہ ہے، رہ نہ سکے۔ اسی وقت غزل لکھی اور مشاعرے میں جا کر شامل ہوئے۔ ان کی وضع قدیمانہ، کھڑکی دار پگڑی، پچاس گز کے گھیر کا جامہ، ایک پورا تھان پستولیے کا کمر سے بندھا۔ ایک رومال پٹری دار تہہ کیا ہوا اس میں آویزاں، مشروع کا پاجامہ جس کے عرض کے پائنچے، ناگ پھنی کی انی دار جوتی جس کی ڈیڑھ بالشت اونچی نوک، کمر میں ایک طرف سیف یعنی سیدھی تلوار، دوسری طرف کٹار، ہاتھ میں جریب، غرض جب داخلِ محفل ہوئے تو وہ شہر لکھنؤ نئے انداز، نئی تراش، بانکے ٹیڑھے جوان جمع، انھیں دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ میر صاحب بے چارے غریب الوطن، زمانے کے ہاتھ پہلے ہی دل شکستہ تھے اور بھی دل تنگ ہوئے اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ شمع ان کے سامنے آئی تو پھر سب کی نظر پڑی اور بعض اشخاص نے پوچھا، حضور کا

وطن کہاں ہے۔ میر صاحب نے یہ قطعہ فی البدیہہ کہہ کر غزل طرحی میں داخل کیا:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کردیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

سب کو حال معلوم ہوا۔ بہت معذرت کی اور میر صاحب سے عفوِ تقصیر چاہی، صبح ہوتے ہوتے شہر میں مشہور ہو گیا کہ میر صاحب تشریف لائے۔"

آزاد کے نگار خانے کا ورق ختم ہوا۔ میر صاحب آصف الدولہ کے یہاں حاضر ہوئے۔ آصف الدولہ لطف و کرم سے پیش آئے۔ دو سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر ہوا۔ نواب بہادر جاوید خان کے یہاں بائیس روپے ماہوار ملتے تھے اور میر صاحب خوش تھے کہ روزگار کی صورت برقرار ہے، اب دو سو ملتے ہیں اور میر صاحب فریاد کرتے ہیں۔

خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

لکھنؤ میں میر صاحب نے عمرِ عزیز کے اکتیس برس گزارے۔ دلّی میں دل کی بربادی کے نوحے تھے، لکھنؤ میں دل اور دلّی دونوں کے مرثیے کہتے رہے:

لکھنؤ دلّی سے آیا یاں بھی رہتا ہے اُداس
میر کو سر گشتگی نے بیدل و حیراں کیا

۲۰ر ستمبر ۱۸۱۰ء کو نوّے برس کی عمر میں میر صاحب کا انتقال ہوا:

مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میر
کیا دوانے نے موت پائی ہے

میر کو شعر و شاعری کی جانب آرزو نے مائل کیا تھا۔ آرزو ہی کی رہنمائی میں میر نے

شاعری کی ابتدائی منزلیں طے کیں ورنہ عین ممکن تھا کہ میر ساری زندگی دیوانہ پن میں گزار دیتے:

کہتا تھا کسی سے کچھ تکتا تھا کسو کا منہ
کل کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دوانہ تھا

آرزو نے میر کی دیوانگی کا رُخ موڑ کر اُسے ایک نئی جہت دے دی۔ ایک دن خانِ آرزو نے کہا، آج مرزا رفیع سودا آئے تھے۔ اپنا یہ مطلع بڑے فخر کے ساتھ سنا گئے:

چمن میں صبح جو اس جنگجو کا نام لیا
صبا نے تیغ کا آبِ رواں سے کام لیا

میر نے یہ سن کر فی البدیہہ کہا:

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

آرزو یہ مطلع سن کر خوشی سے اُچھل پڑے اور کہنے لگے، "خدا نظر بد سے محفوظ رکھے۔" جلد ہی میر کی شاعری کا سارا شہر میں شہرا ہو گیا۔ شہر بھی کوئی ایسا ویسا نہیں، پایہ تخت دارالحکومت۔ جہاں شاہ حاتم موجود تھے۔ حضرت مرزا مظہر جانجاناں مرکزِ رشد و ہدایت تھے، یقین، تاباں، سودا، مرزا محمد رفیع سودا۔ حضرت خواجہ میر درد کہ فرماتے تھے "میر تو میر مجلس خواہی شد۔" بڑے بڑے باکمال موجود تھے۔ ان کی موجودگی میں کمالِ فن کا اظہار اور وہ بھی اس طرح کہ ہر شخص اس کمال کو پوری طرح محسوس بھی کرے اور اس کا اعتراف بھی کرے، میر ہی کا حصہ تھا۔ میر بھی وہ کہ جن کا سودائیانہ طرز مشہور تھا، جن کی انانیت اہلِ سخن کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی، جن کی درویشی میں شاہی کا انداز تھا۔ جن کا سخن خاص پسند ہونے کے ساتھ ساتھ عوام کے جذبات کا مظہر بھی تھا، اہلِ سخن سے نوک جھونک بھی ہوتی، چھیڑ چھاڑ بھی چلتی رہتی۔ سارا شہر ایک طرف، میر تنہا ایک طرف۔ "چابک سواراں یک طرف۔ مسکینِ گدا ہا یک طرف۔"

میر دل تنگ بھی ہوتے۔ ایک دفعہ ایک مثنوی لکھی۔ اژدر نامہ۔ اپنے آپ کو اژدر تصور کیا اور دوسرے شعرا کو سانپ، بچھو، چوہا، کن کھجورا وغیرہ ٹھہرایا اور یہ دکھایا کہ اژدر نے دم بھرا تو سب

کے سب فنا ہو گئے۔ یہ مثنوی ایک مشاعرے میں پڑھی گئی۔ سب نے سنی، سب نے اس راست زد کو محسوس کیا۔ شمع میر محمد اماں نثار کے سامنے آئی تو ایک قطعہ پڑھا کہ مقطع اس قطعے کا یہ تھا:

حیدرِ کرارؓ نے وہ زور بخشا ہے نثار
ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلّے چیر کر

نثار نے اژدر کے کلّے تو بہ اعانتِ زورِ حیدری چیر دیے لیکن میر کی شہرت پر لگا کر اُڑتی رہی اور دیکھتے ہی دیکھتے مجلسوں میں میر بے دماغ کہلانے والے محفل سخن کے مسند نشین ہو گئے۔ مسند نشین اور بھی تھے۔ میر تو اتنے اونچے اُڑے، اتنے اونچے اُڑے کہ عرشِ سخن پر جا پہنچے اور خدائے سخن کہلائے:

ریختہ رُتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے
معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

اردو شاعری میں خدائے سخن ایک ہی ہے اور وہ محمد تقی میر ہیں۔ وحدت میں جس کی حرف دوئی کا نہ آسکے۔ میر کو یہ رُتبہ کیسے حاصل ہوا۔ یہ بات غور طلب ہے اور اسی غور و فکر سے ہمیں اپنے سوال کا جواب مل جائے گا مگر اس غور و فکر کا محور میر کی شاعری ہے اور کسی حد تک اُن کی شخصیت بھی ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے مل جل کر تخلیق کی سطح، پھر معنویت کی ایک نئی دنیا پیش کرتے ہیں۔

میر طبعاً درویش تھے، مسکین تھے، صبر و رضا، توکل اور قناعت ان کا شعار تھا۔ دنیا کی بے ثباتی، انقلابِ زمانہ اور نیرنگیِ دوراں کا تجربہ انھیں نو عمری میں ہو گیا تھا۔ اپنوں کو پرایا ہوتے ہوئے دیکھنا، بنی کا بگڑ جانا، یہ سب میر کے الم ناک ذاتی مشاہدات میں شامل تھا۔ سیاسی انتشار، بد نظمی اور اہلِ کمال کی بے وقعتی نے انھیں اور زیادہ متاثر کیا۔ ذاتی حالات الم انگیز، معاشرتی حالات غم خیز۔ سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا۔ سچا شاعر شعر میں اپنی بپتا کو آفاقی صداقت کے روپ میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔ میر نے بھی یہی کیا۔ ان کی شاعری شخصیت اور حالات کا بہترین اظہار ہے اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ میر یاس پسند ہیں۔ روتے ہیں، آنسو بہاتے ہیں، معمولی معمولی باتوں کو اس تاثیر کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ ہر سننے والا دل تھام کر رہ جاتا ہے۔ عشق کے پردے

اور پیرائے میں زندگی کے حقائق بیان کرتے ہیں، اپنی ذاتی واردات کو ہر حساس انسان کے دل کی دھڑکن بنا دیتے ہیں۔ میر صاحب کے بارے میں یہ اور اس طرح کی بے شمار باتیں کہی جاتی ہیں اور یہ سب صحیح بھی ہیں۔ مگر "وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں۔" یہ ہے کہ میر صاحب سے مل کر، انھیں سن کر اور انھیں پڑھ کر ایک طرح کا تزکیۂ نفس ہوتا ہے۔ تزکیۂ نفس حضرات صوفیا کی اصطلاح ہے اور ایک خاص مفہوم پر محیط ہے۔ میر کے کلام سے جو تزکیہ ہوتا ہے وہ یہ کہ اُن کو پڑھ کر، اُن کے سوز میں ڈوبے ہوئے اشعار سن کر جذبات کی شدت اپنی انتہا کو پہنچتی ہے۔ رحم اور خوف کی آویزش، اُمید و بیم کی کشمکش، جذبات کو ٹھنڈا کر کے قاری کا تزکیہ کر دیتی ہے اور وہ خود کو بہتر اور پاکیزہ تر محسوس کرتا ہے۔ میر کو پڑھنا شروع کیجیے۔ قدم قدم پر ایسے اشعار ملیں گے جن سے قاری کے دل کا چور نکل جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو نئی توانائی کا حامل محسوس کرتا ہے۔ یہ وصف اردو کے دوسرے شاعروں میں بھی ملتا ہے مگر کم کم۔ میر کی طرح نہیں۔ میر کے غم سے عظمت کا ایک احساس بیدار ہوتا ہے۔ یہ ہمیں پستی کی طرف نہیں لے جاتا۔ اس میں ارتفاع ہی ارتفاع ہے۔

میر صاحب یوں تو استادِ سخن تھے۔ مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، ہجو سب کچھ کہا ہے لیکن غزل اور مثنوی سے انھیں خصوصی مناسبت تھی۔ میر کے عہد میں اردو غزل اپنی روایت میں پختہ ہو چکی تھی۔ میر نے اس روایت کو پختہ تر کیا۔ زبان و بیان میں فارسی کے اثر سے آزاد ہو کر عوامی سطح پر گفتگو کی۔ میٹھی اور نرم زبان، سادہ اور دل کش اندازِ بیان، انفرادیت کی گہری چھاپ۔ جی چاہتا ہے کہ یہاں ایک مثال سے سلسلۂ کلام کو آگے بڑھایا جائے۔ خواجہ حافظ فارسی شاعری کے خدائے سخن ہیں۔ مستی سرشاری، بے خودی اُن کا شیوہ اور مجاز میں حقیقت کا طرفہ ماجرا اُن کا شعار ہے۔ خواجہ صاحب کی ایک مشہور غزل ہے۔

عیش مدام است از لعل دل خواہ
کارم بکام است الحمدللہ

بقول سخنورانِ قدیم، مطلع نہیں مطلعِ آفتاب ہے کہ خدائے سخن کی انفرادیت کی گہری چھاپ سے نور ہی نور ہے۔ اساتذہ فن بالعموم دوسرے اساتذہ کی زمینوں میں خامہ فرسائی نہیں

کرتے بقول انیسؔ:

بھلا تردّد بے جا سے ان میں کیا حاصل
اُٹھا چکے ہیں زمین دار جن زمینوں کو

مگر اردو کا خدائے سخن بھی پیچھے نہیں رہا۔ اُٹھائی ہوئی زمین میں اپنی انفرادیت اس طرح نمایاں کر گیا کہ زمین سخن ملک سی ہو گئی۔ میر صاحب کہتے ہیں:

اب حال اپنا ہے اُس کے دل خواہ
کیا پوچھتے ہو الحمدللہ

اس مطلع میں میر کی پوری شخصیت، ان کی شاعری کا پورا حسن اور توانائی جلوہ گر ہے۔ ایک ٹھنڈی سانس، شیوۂ تسلیم و رضا، سپردگی، زندگی کی پوری کش مکش۔ قاری کے لیے تطہیر نفس۔ ''اگر جاناں بدیں شاد است یارب پارہ تر بادا'' امیر خسرو جیسے درویش نے کہا تھا۔ میر تو فنافی المحبوب ہو گئے ہیں۔ ان کی الحمدللہ میں زہر خند نہیں۔ صبر و شکر ہے اور جب مطلع کے ساتھ ہم غزل کے اس شعر کو بھی پڑھتے ہیں:

اوّل کہ آخر ظاہر کہ باطن
اللہ اللہ اللہ اللہ

تو میر کے صبر و رضا اور شیوۂ تسلیم کی اساس پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ میر اردو غزل کی روایت کے بہترین نمائندے ہیں۔ اردو غزل پر اُن کی انفرادیت کی چھاپ بڑی گہری اور ہمہ جہت ہے۔ ان کے نغمے دل موہ لیتے ہیں۔ دل کی گہرائی میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ سادہ سے اشعار عام فہم انداز۔ انسانی نفسیات کا باکمال مشاہدہ، عشق کی شوریدہ سری، حسن کی دلیری، مطالعۂ کائنات میں دیدہ وری۔ حقائق کے ادراک میں آفاقیت، نرمی، دل آویزی۔ میر کی غزل میں کیا نہیں ہے۔ جو کچھ ہے اردو غزل کا سرمایۂ افتخار ہے۔ غزل عجیب صنفِ سخن ہے۔ داخلیت میں ڈوبی ہوئی، بظاہر بے ربط اور ایک دوسرے سے غیر متعلق اشعار کا مجموعہ ہے۔ بباطن بندھے ہوئے موتیوں کی لڑی۔ ہر شعر میں ایک جہانِ معنی اور تمام اشعار میں بحیثیت مجموعی جذبات و واردات کا ایک جہانِ نادیدہ جس کے وجود کو ہم سب محسوس کرتے ہیں۔ میر کی غزل میں یہ جہانِ نادیدہ،

دیدنی بن گیا ہے۔ یہ ایسی دنیا ہے جو ہماری اپنی دنیا سے زیادہ بہتر، زیادہ خوش تر اور زیادہ معنی خیز ہے۔ میر کی یہ دنیا بڑی پُر کشش ہے۔ ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ہمیں اپنا بنا لیتی ہے۔ میر کی کوئی غزل پڑھیے اس میں ایک معنوی وحدت ملے گی، ایک مخصوص مزاج ملے گا۔ زندگی کا سلیقہ اور انسانیت کی آبرو ملے گی:

پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے
رہے گا دیر تک ماتم ہمارا

میر کی مثنویوں میں بھی غزل ہی کی داخلیت کا رنگ و آہنگ ہے۔ مثنویاں میر کی شعری شخصیت کا بہترین اظہار ہیں۔ کچھ آپ بیتی کچھ جگ بیتی۔ سوز عشق کے حوالے سے شوریدگی اور شوریدہ سری کے حوالے سے، دل دوز اور خوں چکاں، ناکامی اور مایوسی کا تابندہ نشاں، میر کے تصور عشق کا توسیعی بیان۔ ان مثنویوں سے بھی پڑھنے والے تطہیر کی منزلوں سے گزرتے ہیں اور ایک نئے حوصلے سے آشنا ہوتے ہیں۔

یہ بھی میر کی زندگی کا المیہ ہے کہ وہ اکتیس برس لکھنؤ میں رہے لیکن وہاں کی فضا اور مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو سکے۔ میر بجھتے چراغوں، کمھلائے پھولوں، ڈوبتی خوشبو اور ماند پڑے رنگوں کے خوگر تھے۔ محفل میں اُجالا دیکھ کر ان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ روشنی کی تاب نہ لا سکے کہ یہ روشنی مصنوعی اور ایک منفی فکری رجحان کی غماز تھی۔ یہ اُن کی کمزوری نہیں انسانی سرشت کا فطری تقاضا تھا۔ ہر رنگ میں ڈھل جانا میر کی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ یک رنگ تھے، یک در گیر و محکم گیر کے قائل تھے۔ میر کی شاعری سیاسی انحطاط میں مبتلا دہلوی معاشرے کی ترجمان ہے لیکن یہ وضاحت ضروری ہے کہ میر کی شاعری سے دہلوی معاشرے کے سیاسی انحطاط کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ تاہم فکر میر کے پھیلاؤ اور وسعت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ انحطاط سیاسی تھا ذہنی نہیں تھا، فکر میں ٹھہراؤ نہیں پیدا ہوا تھا۔ تشکیل نو کی ضرورت تھی۔ میر کی وفات کے سینتالیس برس بعد تشکیل نو کا کام بھی شروع ہو گیا اور یہ فکر ایک نئے انداز سے نمایاں ہوئی۔ میر کی شاعری کا محور اور حوالہ ذہن و فکر کا انحطاط نہیں، خلوص و محبت کے فقدان کا احساس ہے۔ انھیں ساری زندگی شکوہ رہا۔

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا

چھوڑا وفا کو اُن نے محبت کو کیا ہوا

یہ ہمارے عہد کا المیہ بھی ہے مگر ہم اسے تسلیم نہیں کرتے۔ میر میں اتنی اخلاقی جرأت تھی کہ وہ اس فقدانِ محبت کا برملا اظہار کر سکتے تھے۔ ہم اپنی ساری بے باکی کے باوجود اس حقیقت کا اعتراف نہیں کرتے اور اپنی منافقت کی تاویلیں کرتے رہتے ہیں۔

میر نے محبت کی بے زبانی کو زبان عطا کی ہے۔ محبت کا نغمہ ہر شاعر نے چھیڑا ہے لیکن میر کی محبت رسمی اور محدود نہیں۔ یہ ان کے وجود کا بنیادی عنصر ہے۔ اُن کے رگ و پے میں رواں دواں ہے۔ محبت اُن کی فکر، ان کا ذہن، ان کا دل، اُن کی روح ہے۔ ''محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور۔ نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور۔'' اس محبت میں بے راہ روی نہیں، باغیانہ جوش نہیں، نرمی اور دھیما پن ہے۔ جذبۂ تعمیر اور بہتر انسانیت کی تشکیل کا حوصلہ ہے۔ اسی محبت کے وفور نے میر صاحب کو خدائے سخن بنادیا ہے۔

میر نے طویل عمر پائی تھی، اسی مناسبت سے اُن کا کلیات بھی ضخیم ہے۔ انھوں نے چھ دیوان مرتب کیے ہیں۔ میر صاحب، نرے شاعر ہی نہیں اچھے نثر نگار بھی تھے۔ اُن کے نثری کارناموں میں شعرا کا ایک تذکرہ ''نکات الشعرا'' ہے جو ۱۷۵۲ء میں مرتب ہوا۔ نکات الشعرا سے میر کی سخن فہمی، استادی اور انانیت کا احساس ہوتا ہے۔ ''فیضِ میر'' میر صاحب نے اپنے بڑے بیٹے فیض علی کے لیے مرتب کی تھی۔ تیسری کتاب ''ذکرِ میر'' ہے جو ۸۳-۱۷۸۲ء میں اختتام کو پہنچی۔ یہ میر صاحب کی خود نوشت ہے۔ میر صاحب نے سیاسی ماحول کے حوالے سے اپنے حالات کا جائزہ مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کی وجہ سے میر صاحب کے احوال و آثار کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ یہ تینوں کتابیں فارسی میں ہیں۔ انجمن ترقی اردو ''نکات الشعرا'' اور ''ذکرِ میر'' شائع کر چکی ہے۔

بعض شاعروں کا کلام نو عمری میں بھلا معلوم ہوتا ہے۔ بعض جوانی کی شوریدہ سری میں زیادہ پُرکشش نظر آتے ہیں۔ بعض شعرا احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں کہ ہمیں مجبوراً اُن کی انگلی پکڑ کر اُن کے ساتھ چلنا پڑتا ہے مگر میر صاحب_ وہ تو صرف محبت کرنا سکھاتے ہیں۔ اپنوں

سے، غیروں سے، سب سے، وہ ہر ایک سے صرف یہی کہتے ہیں:

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

مرزا محمد رفیع سودا

"دوستو سنتے ہو، سودا کا خدا حافظ ہے۔۔۔۔۔۔۔عشق کے ہاتھ سے رہتا ہے یہ رنجور سدا"

مرزا محمد شفیع کے انتقال کے بعد جب چہلم کی فاتحہ ہو چکی تو سارے عزیز، اقارب، دوست، احباب جمع ہوئے۔ مرزا محمد رفیع کے سر پر باپ کی پگڑی باندھی گئی۔ سب نے کہا، اب باپ کی جگہ تم ہو، سوداگری کا کارخانہ سنبھالو۔ نقد جنس جو کچھ موجود ہے اس کا جائزہ لو۔ کاروبار بند پڑا ہے، از سرِ نو جاری کرو، جوان آدمی ہو، نئے رستے نکالو، نئی طرح ڈالو۔ سب سمجھا بجھا کر اپنے اپنے گھر رخصت ہوئے۔ مرزا رفیع نے جائزہ لیا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کیسی سوداگری اور کہاں کی تجارت، سُونا گھر، بھڑوں کا راج، یار دوست، خوشامدی، سخن ساز جمع ہو گئے۔ موسیقار، سازندے، بھانڈ، بھگتیے سب آموجود ہوئے، محفلیں جمنے لگیں، ناچ رنگ، کھیل تماشے شروع ہو گئے۔ محمد شاہی دلّی، گھر گھر چھماچھم، یہاں بھی طبلے ٹھنکنے لگے۔ ستار، طنبورے، تان پورے چھڑ گئے۔ دولت کی گنگا بہنے لگی، جو جس کے ہاتھ لگا لے بھاگا۔ مرزا کو شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی۔ فارسی میں کچھ ہوں ہاں، غوں غاں کر لیتے تھے، اب پورے شاعر بن بیٹھے۔ کچھ عرصہ ناچ رنگ لہو و لعب اور سرمستی میں گزرا تو یوں محسوس ہوا کہ باپ دادا کی کمائی کو جیسے پر لگ گئے۔ جمع جتھا سرکنے لگا، احساس ہوا کہ یہی لچھن رہے تو بدن پر لنگوٹی بھی سلامت نہ رہے گی۔ کچھ عزیز پیاروں نے سمجھایا، کچھ باپ کے یار دوستوں نے شرم دلائی۔ خاندانی عزت و وقار کا خیال آیا۔ باپ دادا بخارا کے عزت دار، سودگران ذی اعتبار، ماں مرشد قلی خاں کی بیٹی، وہ مرشد قلی کہ شاہ جہاں کی آنکھ کا تارا، اورنگ زیب کا دُلارا، تلوار کا دھنی، فہم و فراست میں یکتا۔ اورنگ زیب کی رفاقت میں مردانہ وار جان دینے والا۔ ساری باتیں ذہن میں گھومنے لگیں۔ ہاتھ روکا، مگر چھلنی اپنی پیاس بجھا چکی تھی۔ اُلفتے سارا اندوختہ کھا چکے تھے۔ باپ کی موت کو دو برس

بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ مرزا ہاتھ جھاڑ کر کھڑے ہو گئے۔ مایا رخصت ہو گئی، مایا مچھندر رہ گئے۔ اب اس کے سوا کیا چارہ تھا کہ روزگار تلاش کریں۔ سوداگری کا رستہ مسدود کہ پیسہ پاس نہیں۔ کوئی کام آتا نہیں، سوداگر کے بیٹے، رئیس زادے مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ امرا کی مصاحبت اختیار کی، اچھے دن دیکھے تھے۔ علم مجلسی کے ماہر تھے، خوش اخلاق، بذلہ سنج، برجستہ گو، ظریف طبع، بات بات میں پھلجھڑی چھوڑتے۔ شاعری میں بھی برق ہو گئے تھے۔ جس دربار میں گئے قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ اپنی شاعری کو ترقی دی۔ اسی کو بنیاد بنایا۔ شاہ جہاں آباد کے خوش گو، ریختے میں اپنے جوہر دکھا رہے تھے۔ شاہ حاتم، آبرو، مضمون، حضرت میرزا مظہر جانِ جاناںؒ، یقین، تاباں، حشمت سب اسی نئے محاورے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور تو اور استاد الشعرا مرزا سراج الدین علی خاں آرزو، جن کی فارسی شاعری، لغت نگاری اور انشاپردازی کا آوازہ ایران توران میں بھی تھا، اسی شاعری کی سرپرستی کر رہے تھے۔ ایک دن خانِ آرزو نے مرزا کو بھی سمجھایا۔ کہنے لگے، مرزا فارسی تمھاری مادری زبان تو ہے نہیں۔ بڑا سا کھا کرو گے تو ہندی فارسی کے اساتذہ میں شمار کر لیے جاؤ گے۔ اہلِ زبان میں اعتبار نہ پاؤ گے۔ یہ دور دوسرا ہے۔ وقت کا تقاضا کچھ اور ہے، بہتر یہ ہے کہ ریختہ اختیار کرو اور اس میں اپنے جوہر دکھاؤ۔ کوئی دن جاتا ہے کہ فن شعر میں تمھارے نام کا ڈنکا بجے گا۔ مرزا کو بھی یہ بات مناسب معلوم ہوئی۔ فارسی چھوڑ ریختہ میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ ریختہ گویان شاہ جہاں آباد میں ان کا بھی شمار ہونے لگا۔ خانِ آرزو نے مشورے پر ہی اکتفا نہیں کیا، ہم چشموں میں اعتبار بھی بڑھایا۔ ہوا یہ کہ ایک دن مرزا رفیع نے کہ سودا تخلص کرنے لگے تھے۔ محفل میں اپنا یہ مطلع سنایا:

آلودۂ قطرات عرق دیکھ جبیں کو
اختر پڑے جھانکیں ہیں فلک پر سے زمیں کو

قبل اس کے کہ کوئی سخن چیں اعتراض کی طرح ڈالتا اور کہتا کہ واہ مرزا واہ۔ مطلعِ قدسی کا کیا اچھا ترجمہ کیا۔ خان آرزو نے فی البدیہہ فرمایا:

شعر سودا حدیث قدسی ہے
چاہیے لکھ رکھیں فلک پہ ملک

مرزا رفیع بے اختیار ہو کر خان آرزو کے گلے لگ گئے کہ خانِ موصوف نے ان کے کلام کو حدیث قدسی قرار دے کر ان کی عزت بڑھائی۔

سودا کا تخلص کرنا بھی عجائب سے ہے۔ باپ کی سوداگری کا تلازمہ کہو یا ایک درویش روشن ضمیر کی دعا کا کرشمہ۔ بات یوں ہے کہ ایک درویش، مرزا رفیع کے حال پر توجہ رکھتے تھے۔ باپ مرے تو پوچھا، کیا چاہتے ہو۔ یہاں آنکھوں میں سرسوں پھولی ہوئی تھی۔ کہنے لگے، خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ بس دولت سخن چاہتا ہوں۔ درویش مستجاب الدعوات، متبسم ہوئے۔ فرمایا، سودا ہے۔ پھر ارشاد ہوا، ان شاء اللہ شہرت تیری چہار دانگ ملک میں بے حد و حساب ہو گی اور عمر تخلص کے ہم عدد۔

شاہ حاتم اس عہد میں استاد الاساتذہ تھے۔ مدتوں عمدۃ الملک امیر خاں کی سرکار سے وابستہ رہے۔ پھر نجانے میں کیا سائی کہ چار ابرو کا صفایا کیا۔ راج گھاٹ کے راستے میں قلعے کے نیچے شاہ تسلیم کے تکیے میں اپنی نشست گاہ بنالی۔ شام کو وہیں بیٹھتے۔ پچاس برس اس وضع داری کو نباہ دیا، وہیں بیٹھے درویشی میں امیری کے ٹھاٹ دکھاتے رہے۔ سودا بھی ان ہی کے دامن تربیت سے وابستہ ہو گئے۔

شاہ حاتم نے ہونہار شاگرد کی تربیت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ مرزا کو فطرت نے شعر و شاعری ہی کے لیے خلق کیا تھا۔ طبیعت ہمہ رنگ اور ہمہ جہت تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے شاہ جہاں آباد میں دھوم ہو گئی۔ حاتم سا استاد، مرزا کو اپنے لیے باعث فخر قرار دینے لگا۔ مرزا کے کلام کی اصلاح نہیں ہوتی تھی۔ استادی کے شرف میں اضافہ ہوتا تھا۔ شاہ صاحب اکثر صائب کا مقطع پڑھتے تھے۔

از ادب صائب خموشم ورنہ در ہر وادیٔ
رُتبہ شاگردی من نیست استاد مرا

اس زمانے میں شاہ جہاں آباد کے سخن گو ایک شعری لسانی انقلاب سے گزر رہے تھے۔ سات آٹھ سو برس فارسی کا رواج نہیں راج رہا تھا۔ فارسی شاعری ہی وجہ نازش اربابِ سخن تھی۔ ریختہ گویوں نے بھی اسی کا تتبع کیا۔ اُس عہد کے خوشنوایانِ فارسی کی طرح اپنی شاعری کی

بنیاد ایہام گوئی پر رکھی۔ ایک لفظ کو بنیاد شعر قرار دیا اور اس کے مختلف معنوں سے اشعار میں بو قلموں معنویت پیدا کرنے کی ڈھن میں حد سے گزر گئے:

کنجی اس کی زبان شیریں ہے
دل مرا قفل ہے بتاسے کا

شاہ حاتم اور حضرت میرزا مظہر جانِ جاناںؒ نے اس روش کے خلاف جہاد کیا۔ ایہام گوئی کو ترک کیا۔ صاف اور سادہ، معنی خیز شاعری کو رواج دیا۔ مرزا رفیع اگرچہ دریائے ایہام کے شناور نہیں تھے تاہم انھوں نے اپنی شاعری کو اس بے کیف رنگ ڈھنگ سے بالکل محفوظ رکھا۔ یہ بھی ان کی شاعرانہ صلاحیت اور سوجھ بوجھ کا بھرپور اظہار تھا۔

شاہ جہاں آباد شعری لسانی انقلاب سے بھی گزر رہا تھا اور معاشرتی سطح پر افراتفری، ہلچل، اضطراب اور بے راہ روی بھی نمایاں تھی۔ اورنگ زیب عالم گیر کی آنکھ بند ہوتے ہی سلطنت ضعف کا شکار ہوگئی تھی اور اب کہ محمد شاہ کا دور تھا، راگ رنگ، سرخوشی، سرمستی، شاہد و شعر کا گھر گھر چرچا تھا۔ در و دیوار سے نغمے اُبل رہے تھے۔ پیر و جوان سب مست، انجام سے بے خبر دادِ عیش دے رہے تھے۔ سودا مختلف امرا کی مصاحبت میں رہے۔ بسنت خاں خواجہ سرا کی سرکار سے وابستہ رہے۔ مہربان خاں کے متوسلین میں شامل رہے۔ طبیعت میں پانی کی سی روانی، دریا کی سی طغیانی تھی۔ قصیدے کہے تو ایسے کہ دھوم مچ گئی۔ ریختہ رُتبہ کو پہنچا دیا۔ عرفی، انوری، خاقانی کی زمینوں میں وہ جولانی کہ استادانِ فن نے لوہا مان لیا اور کہہ اُٹھے کہ راہ مضمونِ تازہ بند نہیں۔۔۔ غزل میں مضمون آفرینی، خیال بندی اور تمثیل کا وہ زور کہ صائب کی یاد تازہ ہوگئی۔ مرثیے میں نیا انداز، امام مظلوم کے مصائب کے بیان، سراپا اعجاز اور ہجو گوئی میں قیامت، ظرافت کی وہ کیفیت کہ جو پھبتی کہہ دی زباں زدِ خاص و عام ہوگئی۔ میر صاحب کے یہاں ہر مہینے کی پندرہ کو مشاعرہ ہوتا تھا۔ فضل علی دانا کہ ایک مرد نادان تھے، سیاہ فام، بیچا، کالی ڈاڑھی اور اوپر سے کالے کپڑے پہنے، مشاعرے میں نازل ہوئے۔ مرزا نے دیکھا مسکرائے اور بولے، یارو ہولی کا ریچھ آیا۔ ہونٹوں نکلی، کوٹھوں چڑھی، سارے شہر میں "ہولی کا ریچھ" مشہور ہوگئے۔ مگر مرزا ہجو کے معاملے میں پہل نہیں کرتے تھے۔ جب دیکھتے کہ پانی سر سے اونچا ہوگیا تو پھر ایسی خبر

لیتے کہ حریف چھٹی کا کھایا بھول جاتا۔ محمد شاہی سرمستیوں نے نظم سلطنت کو بالکل تباہ کر دیا تھا۔ شیدی فولاد خاں شہر کوتوال تھے۔ سیاں بھئے کتوال اب ڈر کا ہے کا۔ چور اچکوں، صبح خیزیوں، اٹھائی گیروں، ٹھگوں، غنڈوں، بھانکڑوں کی بن آئی تھی۔ شہریوں کی راتوں کی نیندیں حرام ہوگئی تھیں۔ کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ مرزا نے کوتوال کی ہجو لکھی، کیا خوب نقشہ کھینچا ہے۔ کوتوال نے شہر کے سارے چوروں کو جمع کیا۔ ان سے درخواست کی کہ آپ چوری نہ کریں۔ کسی کی کوئی چیز پسند آجائے تو اس کی قیمت مجھ سے لے جائیں۔ یہ تقریر جاری تھی کہ ایک چور نے کھڑے ہو کر کہا دس روپے مجھے دلوایئے، کوتوال نے کہا، خیر تو ہے۔ اُس نے کہا، خیر بخیر، نراشر ہے، آپ کی پگڑی مجھے پسند آگئی ہے۔ دس روپے کی ہوگی۔ دس روپے دے دیجیے۔ کیا بے بس کوتوال تھا۔ کیوں بے بس تھا۔ انتظامیہ بے بس اور مفلوج تھی کہ احتساب نہیں تھا۔ سودا اپنا وار کر گئے۔ تا قیامت شیدی فولاد خاں مفلوج انتظامیہ کی علامت بن کر اولی الابصار کے لیے سامانِ عبرت فراہم کرتے رہیں گے۔ مغلوں کی عسکری تنظیم سودا کے عہد میں پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ فوج بے سردار، سپاہی بد دل، سوار بے اعتبار، حوصلہ مُردہ، تلواریں زنگ خوردہ، لشکری درماہے سے محروم۔ شاگرد پیشہ تنخواہ نہ ملنے سے مغموم مگر یہی لشکر معاشرے کی اصل و اساس تھا۔ اسی پر معاشرتی زندگی کا سارا قیاس تھا۔ مرزا نے گھوڑے کو اس لشکر بے اثر کی علامت ٹھہرایا اور طنز و مزاح کا نشتر چلا کر ہمیشہ کے لیے ہنسنے ہنسانے کا سامان فراہم کر دیا:

اِک دن گیا تھا مانگے یہ گھوڑا برات میں
دولھا جو بیاہنے کو چلا اس پہ ہو سوار
سبزے سے خط سیاہ و سیہ سے ہوا سفید
تھا سر و سا جو قد سو ہوا شاخ بار دار
پہنچا غرض عروس کے گھر تک وہ نوجواں
شیخوخیت کے درجے سے کر اس طرف گزار

بظاہر یہ ساماں تفریح ہے لیکن اس ہنسی کے پس پشت گہرا معاشرتی شعور نمایاں ہے۔ اس کی بنیاد نفرت نہیں محبت ہے۔ وہ محبت جو ہر ہوش مند انسان کو اپنے وطن، معاشرے اور

اہلِ وطن سے ہوتی ہے۔ مرزا نے اپنے عہد کے مختلف پیشہ وروں کے حالات کی ابتری کا نقشہ بھی اسی انداز سے کھینچا ہے۔ دراصل ان کا مقصد اصلاحِ احوال تھا۔ جہاں کہیں کوئی معاشرتی ناہمواری نظر آتی ہے، مرزا اُسے اپنی طنز و تضحیک کا نشانہ بنا کر اصلاح کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ مولویوں کی ہٹ دھرمی مشہور ہے۔ ایک مولوی نے فتویٰ دے دیا، کوا حلال ہے۔ سودا نے ہجو لکھی، "اک مسخرا یہ کہتا ہے کہ کوا حلال ہے۔" مولوی کا نام و نشان مٹ گیا۔ نہ فتویٰ رہا، نہ مفتی رہے مگر سودا کی نظم آج بھی زندہ ہے۔

سودا شاہ جہاں آباد میں خوش رہے۔ مطمئن رہے، منظم و محترم رہے، امیروں میں مقبول، شعر و نغمہ کے مخزن، ہم چشموں میں مرد معقول رہے۔ شعرا ان کی تیغ زبان سے لرزاں، دولت احباب ان کے کلام پر نازاں مگر شاہ جہاں آباد میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ "شامت اعمال دہلی صورت نادر گرفت۔" شہر کیا تھا ایک دریائے خوں تھا۔ سودا بھی اسی دریائے خوں کے شناور تھے۔ سب کچھ دیکھتے رہے اپنے مربیوں، قدردانوں، مہربانوں، دوستوں، عزیزوں اور رفیقوں کی بربادی دیکھی، چمن زاروں کو خرابوں میں تبدیل ہوتے دیکھا۔

خاک و خوں میں صورتیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں
اے فلک باتیں تری کوئی نہ بھلیاں دیکھیاں

☆

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

امی جمی ہوئی، زندگی اپنی نہج پر آنے لگی کہ پھر ابدالی نے رہا سہا حوصلہ بھی ختم کر دیا۔ مرزا انقلابِ زمانہ کی تاب نہ لا سکے اور شاہ جہاں آباد کو نظر حسرت سے دیکھتے ہوئے فرخ آباد چلے گئے:

جب اُس چمن سے چھوڑ کے ہم آشیاں چلے
اک ہم صفیر نے بھی نہ پوچھا کہاں چلے
کیا لے لیا تھا ہم نے اُلجھتا جو کوئی خار
جوں گل ہم اس کے باغ سے دامن کشاں چلے

بنگش نوابوں کا دارالحکومت فرخ آباد جسے نواب محمد خاں بنگش نے فرخ سیر کے ایما سے آباد کیا تھا، سودا کے لیے سراپا لطف و کرم تھا۔ سودا نے بڑے سکون اور اطمینان سے دس گیارہ برس اس دیار میں گزار دیے۔ شجاع الدولہ نے فیض آباد طلب کیا، نہ گئے۔ رباعی لکھ کر بھیج دی:

سودا پئے دنیا تو بہ ہر سو کب تک
آوارہ ازیں کوچہ باآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نا کہ دنیا ہووے
بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

یک در گیر و محکم گیر اسی کو کہتے ہیں۔ دلّی میں معاشرتی ناہمواریوں کے خلاف جہاد کرتے رہے تھے۔ یہاں فدوی لاہوری کا مقابلہ کرنا پڑا۔ فدوی کا جھگڑا سودا کے ایک شاگرد شیدا سے تھا۔ لپیٹ میں خود سودا بھی آ گئے۔ فدوی جوش میں لاہور سے فرخ آباد پہنچ گئے۔ آدمی تھے خود پسند اور برخود غلط، ہر کس و ناکس کے کلام میں کیڑے ڈالتے تھے۔ ہر ایک کے شعر پر اعتراض، اپنی بیاض کو بہتر از دیوان جامی قرار دیتے تھے۔ بھلا ایسے خود پسندوں کی کس سے نبھتی۔ سودا تو پھر سودا تھے۔ ایسی ہجو لکھ دی کہ سارے بل نکل گئے۔ "بنیے کے الّو" کی پھبتی ایسی چپکی کہ آج تک اردو شاعری میں "کہے ہے خلق وہ جاتا ہے الّو بنیے کا۔۔۔ ہر ایک دیکھنے آتا ہے الّو بنیے کا" مشہور چلا آتا ہے۔

فرخ آباد میں وقت اچھا گزر رہا تھا مگر وہ جو کہتے ہیں کہ وقت سدا ایک سا نہیں رہتا۔ یہاں بھی وہ صحبت نہ رہی۔ محفل درہم برہم ہوگئی۔ احمد خان بنگش نقد بصارت کھو بیٹھا۔ سودا کا مربی اور سرپرست مہربان خاں رند اس کے علاج معالجے میں مصروف ہوا۔ کہاں کی شاعری کہاں کی سخن دانی۔ کس برتے پر تتاپانی۔ زندگی گزارنا مشکل ہوگئی۔ سودا نے جب کوئی چارہ کار نہ دیکھا تو مہربان خاں کا شکریہ ادا کر کے بنگلے کا راستہ لیا جہاں شجاع الدولہ کے فیض سے فیض آباد دلّی کی ہم سری کا دعوے دار ہو گیا تھا۔ شجاع الدولہ نے سودا کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ عزت و احترام سے دربار میں رکھے گئے۔ ہر طرف چرچا ہو گیا کہ مرزا محمد رفیع سودا نے فیض آباد کو مرکز شعر و سخن بنا دیا ہے۔ خوش ہونے والے بہت تھے مگر ایسے سخن چیں بھی تھے جنھیں مرزا کا آنا ایک آنکھ نہ بھایا۔ انھیں

میں میر ضاحک بھی تھے کہ مرزا کی طرح شاہ جہاں آباد سے آئے تھے اور نواب کے مزاج میں دخیل تھے۔ ضاحک اردو شاعری میں ایک بڑے نامی گرامی دبستاں کے بانی ہیں۔ بیٹے میر حسن نے سحر البیان لکھ کر شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں مسند حاصل کی، پوتے میر خلیق تھے کہ مرثیہ گوئی میں نئے انداز کے بانی ہوئے، پرپوتے انیسؔ مونسؔ اور انسؔ نے مرثیہ نگاری اور اردو شاعری کو نئی جہت اور امکانات سے آشنا کیا۔ ضاحک بھی شعر کہتے تھے مگر انداز ظریفانہ تھا جو سودا کے سلسلے میں حریفانہ ہو گیا۔ سودا نے بہت پہلو بچایا۔ سیّد کی ہجو سے زبان قلم آلودہ نہ ہو مگر جب پانی سر سے گزر گیا تو جوابی کارروائی کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ جوابی حملہ ہوا اور ایسا کہ ضاحک رہتی دنیا تک کے لیے مسخرگی، پُرخوری، خفیف الحرکاتی اور سفلہ پروری کی علامت بن گئے۔ کیا رسا دماغ پایا تھا، سودا نے ضاحک کی ہجو میں نئے سے نیا پیرایہ نکالا۔ ان کی پُرخوری کی داستان کیا دلچسپ انداز میں لکھی ہے:

گھر میں اب جس کے دیگچہ کھڑکے
در پہ اس کے یہ بیٹھے یوں اڑ کے
گور سے پھر جو رستم اُٹھ کر آئے
میّت اس کی اُٹھائے یا نہ اُٹھائے
آگ لگ کر کسی کے گھر سے دود
ایک ذرّہ بھی گر کرے ہے نمود
لوگ تو دوڑے ہیں بجھانے کو
دوڑے یہ لے رکابی کھانے کو
ہر کسی بنیے کی دکان پہ جا
کام ہر وجہ اپنا کر لے وے
اپنی باتوں میں اُس کو لے ہے لگا
کلّے بندر کی طرح بھر لیوے

یہ ادبی معرکہ ضاحک کے دم تک چلتا رہا۔ ان کی آنکھ بند ہوتے ہی سودا نے یہ سلسلہ

بالکل ختم کر دیا۔۔۔ اُس عہد کی وضع داری تھی۔ آدمی ختم ہو گیا، سارے جھگڑے ختم ہو گئے۔ سودا نے یہ سلسلہ بالکل ختم کر دیا۔ سودا ویسے بھی پہل کرنے کے قائل نہ تھے۔ جوابی کارروائی پر مجبور ہوتے تو پھر ایسا بھرپور وار کرتے کہ دشمن چین بول جاتا۔

شجاع الدولہ کا دور ختم ہوا۔ آصف الدولہ نواب وزیر اودھ ہوئے۔ بنگلہ اُجڑا، لکھنؤ آباد ہوا۔

خدا آباد رکھے لکھنؤ کو پھر غنیمت ہے
نظر کوئی نہ کوئی اچھی صورت آ ہی جاتی ہے

آصف الدولہ کے ساتھ سودا بھی لکھنؤ آ گئے۔ اعزاز و اکرام برقرار رہا مگر وہ جو مقدر ہو چکا تھا کہ جس شہر میں جاؤ گے حریفوں سے معرکہ آرائی ضرور ہو گی۔ یہاں بھی فاخر مکین کہ فارسی کے خوش گو شاعر تھے، مرزا کے منھ آئے اور منھ کی کھائی۔ ہجو لکھی تھی:

نہ دید از خود فروشی دشمن ما جنس بیہودے
بازارِ جہاں دار و عبث سودائے بے سود
دکانے چیدہ بہر گرمی بازار از سودا
ندارد گرچہ غیر از آہ محرومی دم و دودے

مگر سودا تو ان معاملات میں شمشیر برہنہ تھے۔ ان سے پیش پانا کہاں ممکن تھا۔ مکین کو لکھنؤ بھی چھوڑنا پڑا اور منھ میں کالک لگی وہ الگ۔ سودا ان کو بھی ہمیشہ کے لیے رسوا کر گئے۔

سودا کے دم قدم سے لکھنؤ میں شعر و سخن کو بڑی رونق ہوئی۔ خوش گو شعرا دلّی سے ہجرت کر کے یہاں آنے لگے۔ میر سوز پہنچے، سودا کے انتقال کے بعد میر صاحب نے بھی یہیں کا رُخ کیا۔ میر حسن باپ کے ساتھ پہلے ہی آ گئے تھے۔ مگر انھوں نے لکھنؤ کو مستقر نہیں بنایا۔ فیض آباد ہی میں رہے۔ انشا آئے، مصحفی آئے، جرأت آئے، بڑی رونق ہو گئی۔ سودا نے اودھ میں بھی دس برس گزارے۔ کچھ خوش رہے کچھ ناخوش۔ اُس زمانے میں عام دستور کے مطابق تنخواہ ملنے میں لوہے لگ جاتے تھے۔ یہ مرد خوش اوقات، یار باش، ہاتھ کھلا ہوا، سیر چشم، اکثر پریشان رہتے مگر طبیعت میں شگفتگی، مزاج میں شوخی اور زندہ دلی تھی۔ اس وجہ سے "بر سر فرزندِ آدم ہر

چہ آید بگزرد" کہتے اور تحمل سے کام لیتے بڑی بھرپور زندگی گزاری، خود بھی ہنستے رہے، دوسروں کو بھی ہنسایا۔ جہاں رہے ہر دل عزیز رہے۔ کامیاب رہے، ۱۱۹۵ھ میں یہ ہنسنے ہنسانے والا احباب اور اعزہ کو ہمیشہ کے لیے سوگوار کر گیا۔

سودا کجا و آں سخن دل فریبِ اُو

سودا بڑے محفل آرا اور ہنگامہ آرا انسان تھے۔ شکست، پسپائی، سپر ڈال دینا ان کا مزاج نہیں تھا۔ کسی سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے تھے مگر ٹھن جاتی تو پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ تُرکی بہ تُرکی جواب دیتے تھے۔ کوئی ناہمواری دیکھتے تو تنقید کرتے۔ خلوص اور نیک نیتی سے مزاح کا نشانہ بناتے، دبتے کسی سے نہیں تھے۔ طرح دینے کے بھی قائل نہیں تھے۔ دلّی میں تھے تو چونکھی لڑاتے رہے۔ بقا کی ہجو لکھی، ندرت کشمیری سے معرکے رہے۔ ندرت نے بڑا زور لگایا، بڑی شاعرانہ صلاحیت دکھائی۔ سودا کی ہجو لکھی:

خون معنی تا رفیع باد پیا ریختہ
آبروئے ریختہ از جوش سودا ریختہ

سودا نے اسی کو خمسہ کرکے ندرتؔ پر اُلٹ دیا:

شعر ناموزوں سے تو بہتر ہے کہنا ریختہ
کب کہا میں قتل کر مضمون کسی کا ریختہ
بے حیائی ہے یہ کہنا سن کے میرا ریختہ
خون معنی تا رفیع باد پیا ریختہ
آبروئے ریختہ از جوش سودا ریختہ

حکیم فوقی کا خاکہ اُڑایا۔ نوے سالہ شیخ جی کے چاند سی بنو بیاہ لانے کے بعد جوتیاں کھانے کی داستان لکھی۔ شہر آشوب لکھے، فرخ آباد میں فدویؔ، فیض آباد میں ضاحکؔ اور لکھنؤ میں فاخر مکینؔ سے بیت بجتی رہی اور ہر جگہ ور رہے۔ یہ ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو تھا۔ سودا ہر صنف میں بہتے دریا تھے۔ قصیدے لکھے تو معنی کے پھول کھلائے۔ مرثیے لکھے تو دلوں میں گداز پیدا کر دیا۔ غزل میں ان کا انداز سب سے الگ ہے۔ نئے تجربے بھی ہیں، حیات و کائنات کے مسائل

بھی ہیں۔ پیرایۂ عشق میں زندگی کا بھرپور اظہار بھی ہے۔ بعض سخن شناس مرزا کے قصائد پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ ان کی غزلوں کو نظر انداز ہی کر گئے۔ مگر سودا اردو غزل کی بڑی نمایاں اور بھرپور آواز ہیں۔ فارسی کا اثر اُس زمانے میں عام تھا۔ اردو شاعری فارسی کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔ سودا نے ابتدا ہی فارسی سے کی تھی۔ اردو میں اس رنگ کو بڑے سلیقے اور اہتمام سے نباہ دیا:

نے بلبل چمن نہ گل نو دمیدہ ہوں
میں موسم بہار میں شاخ بریدہ ہوں
گریاں بہ شکل شیشہ و خنداں بطرز جام
اس میکدے کے بیچ عبث آفریدہ ہوں
تو آپ سے زباں زد عام ہے ورنہ میں
یک حرف آرزو سے بلب نارسیدہ ہوں
ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

سودا نے اردو شاعری میں ہندی کی آمیزش سے ایک نیا اور انوکھا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انھیں اپنی شعری صلاحیت کا احساس تھا:

سودا کے خیالات میں جھمکے ہے خدائی
جو اپنے تخیل میں یہ چاہے سو وہیں ہو
اس آمیزش سے ایک نیا اور بہتر رنگ پیدا ہوا:
نکل کے چوکھٹ سے گھر کی پیارے
جو پٹ کی اوجھل ٹھٹک رہا ہے
سمٹ کے گھٹ سے تیرے درس کو نین میں جی آ اٹک رہا ہے
اگن نے تیری برہ کی جب سے جھلس دیا ہے کلیجہ میرا
ہیے کی دھڑکن میں کیا بتاؤں یہ کوئلہ سا چٹک رہا ہے
مجھے پسینہ جو تیرے مکھ پر دکھائی دے ہے تو سوچتا ہوں

یہ کیوں کہ سورج کی جوت آگے ہر ایک تارا چھنک رہا ہے

جو میں نے سودا سے جا کے پوچھا

تجھے ہے کچھ اپنے من کی سدھ بدھ

یہ رو کے مجھ سے کہا کسی کی لٹ میں لٹک رہا ہے

سودا نے زندگی کے سوز کو پوری طرح محسوس کیا تھا وہ اس کا اظہار بھی کر گئے مگر غم میں ڈوب کر نہیں، طمانیت اور سرخوشی کے ساتھ۔

جو گزری مجھ پہ مت اس سے کہو ہوا سو ہوا

بلاکشان محبت پہ جو ہوا سو ہوا

مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر

مرے لہو کو تو دامن سے دھو ہوا سو ہوا

حادثاتِ زندگی کے بارے میں ہر شخص کا ردِّ عمل دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ بعضے محض آنسو بہاتے ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو وقتی طور پر متاثر ہوتے ہیں اور پھر بے غل و غش حالات کے دھارے میں بہنے لگتے ہیں۔ بعضے سب کچھ برداشت کرتے ہیں اور اپنے مزاج کی شگفتگی کی وجہ سے خوش و خرم اور مطمئن رہتے ہیں کہ یہ تو ہونا ہی تھا۔

سودا خوش و خرم رہنے والوں میں تھے۔ دل پر چوٹ لگتی تو اظہار کر دیتے مگر اس طرح نہیں کہ دوسرے بھی متاثر ہوں۔ بس اظہار کیا اور آگے بڑھ گئے۔ فریاد نہیں کرتے۔ نہ آہیں بھرتے ہیں۔ بس اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں:

تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں

یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

ان کا دعویٰ ہے کہ:

گدا دست اہل کرم دیکھتے ہیں

ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں

یہ حوصلہ مندی اور مردانگی ہے، تماشائے اہلِ کرم کیوں دیکھیں۔ وہ تو اس طنطنے کے

آدمی ہیں کہ:

مگر تجھ سے برگشتہ خاطر ہے سودا
اُسے تیرے کوچے میں کم دیکھتے ہیں

ان کی آزادہ روی اور قلندری اپنی جگہ بھاری پتھر ہے:

وہی جہاں میں رموزِ قلندری جانے
بھبھوت تن پر جو ملبوس قیصری جانے

وہ اپنے ولی نعمت سے بھی نہیں چوکتے، صاف کہتے ہیں:

جو شخص نائب داور کہائے عالم
یہ کیا ستم ہے نہ آئینِ داوری جانے

گلہ شکوہ بھی ہے تو اطمینان کے ساتھ۔ بے صبری، جلد بازی، رونے کا انداز نہیں:

تجھ عشق میں روزِ خوش نہ دیکھا
دُکھ بھرتے ہی بھرتے مر گئے ہم
ہوگی نہ کسی کو یہ خبر بھی
اُس بزم سے آ کدھر گئے ہم

اور ان کی وہ مشہور غزل:

ذکر مرغانِ گرفتار کروں یا نہ کروں

جس سے فیض احمد فیض کو یہ خیال ہوا تھا کہ سودا ہمہ رنگ، ہمہ جہت اور بڑا شاعر ہے۔
یہ داد تو سودا کو اپنی زندگی ہی میں مل گئی تھی کہ بد دماغ نازک مزاج اور خود پسند فارسی شاعر شیخ علی حزیںؔ سے ملاقات ہوئی۔ شعر سنانے کی فرمائش پر مرزا نے مطلع پڑھا:

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

حزیں نے دریافت کیا، ''در زبان ہندی، تڑپے ہے چہ معنی دارد''۔ مرزا نے کہا ''می تپد۔''
شیخ نے زانو پر ہاتھ مار کر کہا، مرزا رفیع قیامت کردی۔ ایک مرغ قبلہ نما رہ گیا تھا اُسے بھی نہ

چھوڑا۔ سودا کے یہاں بڑی کیفیت ہے۔ اس کیفیت میں خمار چشم ساقی بھی شامل ہے:

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

سودا کی استادی یہ کہ زمینیں نئی، اشعار گرم، تیز، شگفتہ:

ساون کے بالوں کی طرح سے بھرے ہوئے
یہ وہ نین ہیں جن سے کہ جنگل ہرے ہوئے

تری گلی سے گزرتا ہوں اس طرح ظالم
کہ جیسے ریت سے پانی کی دھار گزرے ہے

چست ردیفیں:

بولو نہ بول شیخ جی ہم سے کڑے کڑے
یاں چٹ کیے ہیں اس سے عمامے بڑے بڑے

بھر نظر مجھ کو نہ دیکھا کبھی ڈرتے ڈرتے
حسرتیں جی کی رہیں جی ہی میں مرتے مرتے

سوداؔ کا فیض انشاؔ، غالبؔ، ذوقؔ سب کے یہاں ہے:

چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہتِ گُل
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

اس شعر سے انشا کا مشہور شعر "نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری" فوراً ذہن میں آتا ہے، غالبؔ کے یہاں اثریوں واضح ہے کہ سودا کا فرمودہ:

بلبل ہی کو نہیں ہے رُخِ یار کی ہوس
ہے گل کو اس کے گوشۂ دستار کی ہوس

"خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس" میں واضح طور پر جھلکتا ہے۔ ذوقؔ کی غزل "ہوش نقش پا، دوش نقش پا میں" سودا کا اثر پوری طرح نمایاں ہے۔

مرزا بے چارہ خوب آدمی تھا۔ بڑا زبردست آدمی تھا۔ بقول آزاد، غنچہ نامی غلام، قلم دان

لیے ہر وقت حاضر۔ ادھر کسی نے بل کی لی اور انھوں نے قلم سنبھال بل نکال دیے۔ جو کچھ لکھا خوب لکھا۔ حد یہ ہے کہ پہیلیاں تک لکھیں۔ جی ہاں پہیلیاں، بوجھو تو جانیں۔

ایک پہیلا سوا نویلا جو بوجھے سو زندہ رہے۔ زندہ میں سے مردہ نکلے، مُردے میں سے زندہ رہے اتا پتا بتاؤ۔ کھانے کی چیز ہے۔ آج کل جاڑے میں تو گھر گھر طلب ہے۔ سمجھ میں نہیں آئی۔ ارے انڈا ہے۔ واہ بھئی واہ۔ خوب ہے۔ اچھی پہیلی ہے۔ سودا کا ذہن واقعی بڑار سا تھا۔ اس میں کیا شک ہے مگر بھائی، سودا کا سودا کب تک:

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانے میں

خواجہ میر دردؒ

روپ سروپ

بڑی بے بسی کا عالم تھا۔ ہر شخص کو اپنی جان، مال، عزت، آبرو کی پڑی تھی۔ نہ جانے غنیم کب حملہ کر دے۔ خدا معلوم قزلباش کس وقت شہر میں داخل ہو جائیں۔ نادری فوجیں دلّی کو گھیرے ہوئے تھیں۔ حصاری شہر پر کیا منحصر، قزلباشوں نے بیرونِ شہر کے محلّوں، ٹولوں اور علاقوں کی بھی ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ ہر جگہ چوکی پہرا بٹھا رکھا تھا۔ پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ شہر میں رسد کی کمی ہوتی جا رہی تھی۔ خلقِ خدا پریشان تھی۔ دلّی اور اہلِ دلّی کے لیے یہ کوئی انوکھی اور اَن ہونی بات نہیں تھی۔ راج دھانی میں صدیوں سے یہی ریت چلی آتی تھی۔ ایک دور وہ بھی تھا کہ منگولوں کی فوجیں شہر کو گھیر لیتی تھیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت سلطانؒ جی کو اندرون شہر زحمت فرمانا پڑی۔ ایک دفعہ نہیں دو مرتبہ، منگولوں نے شہر کو گھیرے میں لے لیا۔ ناکہ بندی کر دی۔ آپ بیرونِ شہر غیاث پور میں قیام فرماتے تھے۔ علاء الدین نے درخواست کی کہ اندرونِ شہر تشریف لے آئیں۔ مکان کا انتظام کیا۔ چناں چہ حضرت کیلیؒ جنگ کے سپر تھے اور پھر اُس کے بعد ایک دفعہ اور کچھ عرصے کے لیے شہر میں مقیم ہو گئے۔ مگر اس دفعہ صورتِ حال یہ تھی کہ بادشاہ بھی رنگیلا، سلطنت بھی رنگیلی، سرداروں میں پھوٹ، فوج بد دل، رعیت دل برداشتہ، محاصرہ شدید سے شدید تر، زمین سخت، آسمان دُور مگر اس بے بسی کے عالم میں بھی اللہ کا ایک بندہ نہ جانے کس ترکیب اور جتن سے چوکی پہرے والوں کی آنکھ بچا، شہر سے نکل پہاڑ گنج سے گزرتا، برمدے کے نالے جا پہنچا۔ علاقہ یہ بھی قزلباشوں کی زد میں تھا مگر عجیب بات یہ تھی

کہ اس بندۂ خدا نے جس جگہ جا کر دم لیا وہاں دُور دُور تک کوئی لشکری نہیں تھا۔ آدمی نے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا جب یقین ہو گیا کہ آس پاس کوئی فوجی نہیں تو جان میں جان آئی۔ اطمینان کی سانس لی، دل و دماغ میں اب بھی جنگ جاری تھی۔ ذہن تھا کہ مسلسل ملامت کر رہا تھا۔ "نوکری رہے یا جائے، پرائے شگون کے لیے ناک کٹوانا کہاں کی عقل مندی ہے۔ یہاں بات ناک کٹوانے کی نہیں۔ جان دینے کی ہے۔" دل کا تقاضا تھا "آخر وفاداری بھی تو کوئی معنی رکھتی ہے۔ ساری زندگی جس شہزادی مہر پرور کا نمک کھایا اُسے دھاروں دھار روتے دیکھو اور منہ چُرائے ڈیوڑھی میں پڑے رہو۔ یہ نہیں ہو سکتا، شیوۂ مردانگی کے خلاف ہے۔" یہی سوچتا وہ آدمی آگے بڑھا۔ سامنے منزلِ مقصود تھی، مکان کا دروازہ کھلا تھا۔ "درِ درویش رادرباں نباشد" آدمی بے دھڑک اندر چلا گیا۔ حجرے میں داخل ہوا۔ صاف ستھرا حجرا، سفید چاندنی کا فرش، نہ کوئی آرایش نہ زیبایش، مگر در و دیوار سے روشنی پھوٹتی ہوئی۔ دو شخص آمنے سامنے دوزانو اپنے اپنے خیالات میں گم بیٹھے ہوئے۔ ایک پیر مرد، خضر صورت، سفید لباس، نورانی چہرہ، روشن پیشانی، سامنے ایک لکڑی اس انداز کی رکھی جیسے لفظ "ناصر" کا عکس ہو۔ دوسرا نوجوان، انداز سپاہیانہ، وضع درویشانہ، کوئی بیس برس کی عمر، سر جھکائے نظریں نیچی کیے، مؤدب، خاموش۔ نووارد نے بڑھ کر بڑے ادب سے سلام کیا اور پھر دھیمی آواز میں عرض کیا۔ "حضور والا کنیز، شہزادی مہر پرور نے بصد ادب عرض کیا ہے، حضرت والا یوں تو اللہ تعالیٰ ہر جگہ حافظ و ناصر ہے مگر بر مدے کا نالہ شاہ جہاں آباد کی شہر پناہ سے باہر ہے اور ایرانی فوجیں بے تمیز ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ حضرت کے دشمنوں کو کچھ گزند پہنچائیں۔ اس لیے آپ مع اہلِ خانہ کے شاہ جہاں آباد کے اندر چلے آئیں۔ حضور اور حضور کے اہلِ خانہ کے لیے دو محل خالی کروا رکھے ہیں۔"

قاصد یہ پیغام سنا کر خاموش ہو گیا۔ بزرگ نے آنکھ اُٹھائی۔ نوجوان کی طرف دیکھا، نوجوان نے سر اس طرح ہلایا جیسے اشارہ پوری طرح سمجھ گیا ہو۔ پھر بڑے اعتماد سے بولا، "بیگم سے دعا کے بعد کہنا کہ ہم آپ کی اس مہربانی اور ہمدردی کے شکر گزار ہیں مگر ہم لوگ بنی فاطمہ اور خاص کر حسینی سیّد ہیں۔ تلوار کی آنچ سے ڈرنا نہیں جانتے مگر خواتین کے ننگ و ناموس کا خیال ہے۔ اُمید ہے کہ جس خدا نے حسین علیہ السلام کے اہلِ بیت کی کربلا سے دمشق تک حفاظت کی تھی وہی پاک بے نیاز

اِن سیدانیوں کو بھی ہر بلا سے محفوظ رکھے گا کیوں کہ یہ بھی انھیں کی ذُرّیت ہیں۔"

قاصد نے یہ جواب ایسی طمانیت سے سُنا جیسے اُسے پہلے ہی سے پکّا یقین تھا کہ جواب یہی ہو گا۔ ادب سے جھک کر سلام کیا جس طرح آیا تھا اسی طرح رخصت ہو گیا دونوں بزرگ پھر اپنے اپنے خیالات میں مستغرق ہو گئے۔ پانی میں ایک پتھر اچانک آ گرا تھا۔ سطح پر لہریں نمودار ہوئی تھیں۔ لمحے بھر کے بعد پھر وہی سناٹا اور سکون، دونوں بزرگ دنیا و مافیہا سے بے نیاز طمانیت کا سمندر بنے بیٹھے تھے۔ پیر مرد، شاہ جہاں آباد کے مشہور بزرگ خواجہ محمد ناصر عندلیبؔ:

آں ذاتِ مقدس است ہر دم حاضر
بر حال جہانیاں ہر جا ناظر
دستِ من و دامانِ رسولؐ و آں شہ
در ہر دو جہاں خواجہ محمد ناصرؔ

سپاہیانہ انداز، درویشانہ وضع کے حامل نوجوان، اُن کے صاحبزادے "نورالناصر اوّل المحمدین"، خواجہ میر دردؔ کہ درد بن کر ہر پہلو سے سراپا درد بن گئے تھے۔ پندرہ برس کی عمر میں بحالت اعتکاف رسالہ "اسرار الصلوٰۃ" تالیف کر چکے تھے۔ وہی نوجوان خواجہ میر دردؔ جن کے لیے سراج الدین علی خان آرزو جیسے جگت استاد نے "جوانے است خیلے صاحب فہم و ذکا" اور "بایں عاجز رابطہ خاصے دارد و خیلے شفقت بر احوالِ ایں عاجز نماید" (بڑے صاحب فہم و ذکا نوجوان ہیں۔ اس عاجز سے ربطِ خاص رکھتے ہیں اور اس عاجز کے حال پر بڑی شفقت فرماتے ہیں) کے الفاظ لکھے تھے۔ صرف یہی نہیں آرزو نے یہ پیشین گوئی قلم بند کر کے کہ "ان شاء اللہ تعالیٰ از جملہ آں ہائی شود کہ در فن تصوف صاحب نامند" (ان شاء اللہ تعالیٰ اُن لوگوں میں ہوں گے جو فن تصوف میں بزرگ سمجھے جاتے ہیں) خواجہ صاحب کی بزرگی پر مُہر تصدیق بھی ثبت کر دی تھی۔

خواجہ میر دردؔ کا تعلق شاہ جہاں آباد کے ایک معزز خانوادے سے تھا۔ مورثِ اعلیٰ خواجہ بہاء الدین نقش بندؒ، دادا نواب ظفر اللہ، پردادا نواب فتح اللہ، شاہی منصب دار صاحبانِ سیف، نوبت نقارے والے۔ فتح اللہ کے دو بھائیوں سے مغل شہزادیاں منسوب، عالمگیر نے انھیں بھی مغل شہزادی سے عقد کے لیے اشارہ کیا مگر انھوں نے نسب میں رخنہ اندازی گوارا نہ کی، انکار

کر دیا، عالمگیر کے میر بخشی نواب سربلند خاں کی بہن سے شادی کی۔ وہ بھی انھیں کی طرح حسینی سیّد تھے۔ کیا کیا خاندانی روایتیں تھیں حسب نسب کی کیسی پاسداری تھی۔ بادشاہ زادی ٹھکرا دی، خاندان کا وقار برقرار رکھا، دادا، پردادا کی یہ شان، نانا سیّد محمد قادری خاندانی امیر مگر مزاجاً درویش اور قلندر، پرنانا میر احمد خاں شہید، شاہی امیر، خاندیش کے صوبے دار، والد خواجہ محمد ناصر عندلیب، جنھوں نے خاندانی دولت، امارت، منصب سب پر لات ماری۔ مزاج میں قناعت اور درویشی تھی۔ فقر و غنا کو شعار بنایا۔ دنیا اور دنیاداری سے منھ موڑا۔ بزرگ رہ نما اور پیر طریقت شاہ سعد اللہ گلشنؒ کے ایما پر انھیں کے نقش بندی سلسلے میں خواجہ محمد زبیرؒ سے بیعت ہوئے۔ اُن کے فیض سے ایک نئے سلسلے محمدیہ کی بناڈالی۔ امیر المحمدین کہلائے۔ شاہ سعد اللہ گلشن ان کے وہ مربی اور رہنما تھے جو اردو شاعری میں ولی کے رہ نما کی حیثیت سے معروف ہیں۔ خواجہ محمد ناصرؒ کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ بڑے متاثر تھے، تاثر کا سلسلہ بھی خوب ہے۔ گلشن کے پیر و مرشد گل اور گلشن کے والہ وشیدا عندلیب اور ان کے بعد درد، اثر، رنج، الم سلسلہ کہاں سے کہاں پہنچا۔ ”ترے اثر کا خدا سلسلہ دراز کرے۔“ خواجہ محمد ناصر عندلیبؔ، عندلیب گلشن ناآفریدہ نہیں۔ عندلیب گلشن برگزیدہ۔ کون و مکاں در دامن کشیدہ، عجب منکسر المزاج درویش تھے۔ علم و فضل میں یکتا، مریدوں، عقیدت مندوں، طالبانِ عقیدت کے سامنے معرفت کے دریا بہاتے۔ ہر شخص بقدر ظرف سیراب ہوتا مگر استغنا یہ کہ خود کو اُمّی کہتے، ان کے علم و فضل کی ایک جھلک یوں دیکھیے کہ خواجہ محمد زبیرؒ کا وصال ہوا، خلق خدا خواجہ محمد ناصر کے یہاں پُرسے کو جمع ہوئی۔ بے شمار لوگ تھے۔ موقع غنیمت سمجھ کر بہتوں نے اپنی اپنی الجھنیں بیان کیں۔ مختلف مسایل کا حل چاہا، خواجہ محمد ناصر نے سب کے جواب اور تشفی کے لیے ہندی زبان میں ایک قصہ شروع کیا۔ یہ قصہ خوانی تین دن جاری رہی۔ سارے سوالوں کے جواب بیان ہوگئے۔ سننے والے ایسے ریجھے کہ پنڈ پڑ گئے۔ خلقِ خدا کی رہنمائی اور فائدے کے لیے یہ قصہ تحریر میں آنا چاہیے۔ اصرار حد سے بڑھا، خواجہ صاحب نے ہندی کو فارسی کیا۔ قصے کا بزبانِ فارسی بیان شروع ہوا۔ دست راست پر فرزند دل بند اوّل المحمدین خواجہ میر دردؒ بیٹھے جو کچھ خواجہ عندلیبؔ بیان کرتے خواجہ دردؒ لکھتے جاتے۔ وہ نہ ہوتے تو شاعر نغز گفتار میر محمدی بیدار یہ فریضہ انجام دیتے۔ ہوتے ہوتے پوری کتاب تیار

ہو گئی۔ نالہٗ عندلیب نام ہوا۔ بڑی تقطیع کے ۱۸۱۵ صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ شاہ جہاں بیگم والیہ بھوپال کے حسن عقیدت سے دو جلدوں میں چھپ گئی ہے۔ پیرایہ قصے کا ہے۔ "تلک الامثال" ا کتاب کا ہے کو ہے علم و حکمت کا سمندر ہے جہاں سے دیکھیے تہہ در تہہ موتی نکلتے چلے آتے ہیں۔

باپ پر پوت۔۔۔ خواجہ میر درد طبعاً ہونہار اور سعید ازلی۔ باپ کی نیکی اور بزرگی نے ان کی صلاحیت کو اور بھی چمکایا۔ انھیں سے درسیات کی تکمیل کی، مفتی دولت اس عہد کے مشہور استاد تھے۔ ان کی خدمت میں بھی حاضری دی۔ تیرہ برس کی عمر میں والد سے بیعت ہو کر فقر و غنا کی دولت سرمدی کے امین ہو گئے۔

حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوبِ الٰہیؒ نے اپنی ایک بابرکت مجلس میں فرمایا تھا کہ ترکِ دنیا یہ نہیں ہے کہ لنگوٹا باندھ، سب سے الگ تھلگ جنگل میں بیٹھ گئے۔ ترکِ دنیا یہ ہے کہ کھاؤ بھی پیو بھی مگر دنیا سے ملوث نہ ہو۔ خواجہ میر دردؔ کا مسلک یہی تھا۔ والد سے بیعت ہوئے۔ پندرہ برس کی عمر میں رمضان کے آخری عشرے میں بحالت اعتکافِ رسالہ "اسرار الصلوٰۃ" مرتب کیا۔ سلوک کی منزلیں طے کرتے رہے۔ بظاہر مردِ سپاہی بن کر لشکر سے وابستہ ہوئے مگر یہ بھی سلوک کا ایک تجربہ تھا۔ بازار سے گزرو، خریدار نہ بنو، تر و تازگی، شادابی اور رونق سے دھوکا نہ کھاؤ:

مت جا تر و تازگی پہ اس کی
عالم تو خیال کا چمن ہے

تجربہ مکمل ہو گیا تو لشکر کشی سے فراغت حاصل کرلی۔ سپاہِ معرفت کا علم بلند کیا۔ نادری شورش فرو ہو گئی۔ امن جمی ہوئی، شہزادی مہر پرور نے بھی اصرار شروع کیا۔ اصرار حد سے بڑھا۔ ناچار اندرون شہر منتقل ہوئے۔ مگر کس طرح، شہزادی سے کہہ دیا تمھارے محل دو محلے تمھیں مبارک، فقیروں کے لیے معمولی مکان ہی مناسب ہیں۔ شہزادی نے چیلوں کے کوچے میں زمین کا قطعہ خریدا، چھوٹے بڑے نو مکان، ایک بارہ دری جس کے آگے خوب بڑا صحن اور ایک مسجد بنوائی۔ آٹھ مکان عزیزوں اور بال بچوں کے لیے۔ بارہ دری کے پہلو کا نواں مکان تخلیے کے لیے مخصوص ہوا:

مثالِ عکس جو کوئی کہ پاک طینت ہیں
جہاں صفا ہے وہیں بود و باش کرتے ہیں

خواجہ صاحب برمدے کے نالے سے چیلوں کے کوچے منتقل ہوئے تو فرمایا:

ایں اہل زمانہ دردِ ناکم کردند
بے ہیچ عبث، عبث ہلاکم کردند
از چار طرف غبارِ دل ہا چنداں
برخواست کہ زندہ زیرِ خاکم کردند

(ان اہل زمانہ نے مجھے دردناک کر دیا۔ بلاوجہ، بے مقصد، مجھے ہلاک کیا، چاروں طرف سے دلوں کا غبار ایسا اٹھایا کہ مجھے زندہ در گور کر دیا۔)

۱۱۷۲ھ میں خواجہ محمد ناصرؒ کا وصال ہو گیا۔ خواجہ میر دردؒ مسندِ رُشد و ہدایت پر متمکن ہوئے۔ دو برس پہلے ابدالی بھی دلّی کو تاراج کر گیا تھا مگر مرہٹوں، روہیلوں، جاٹوں، فرنگیوں سب کے دندانِ آز تیز تھے۔ غریب کی جورو سب کی بھابی، بے چاری دلّی کو سبھی بُری نظر سے دیکھ رہے تھے۔ خواجہ صاحب برمدے کے نالے سے اندرون شہر تشریف لے آئے تھے۔ یہی اُن کی آخری منزل قرار پائی۔ سارے وقت حجرے میں بیٹھے رہتے۔ نماز کا وقت ہوتا تو مسجد چلے جاتے۔ وہ بھی کون سی دُور۔ حجرے سے متصل۔ ایک وقت خاص حجرے سے نکل کر بارہ دری میں آ بیٹھتے۔ لکھ دانا تسبیح جس کا بڑا سا ڈورا کہ بارہ دری کے چاروں کونوں تک آسانی سے پہنچ جائے سامنے رکھی ہوئی، خود بدولت اور تمام حاضرین اپنی اپنی جگہ تسبیح کا ڈور اُٹھا لیتے، کلمے کا ورد شروع ہو جاتا۔ جو شخص بھی محفل میں حاضر ہوتا، ادب سے سلام کرتا۔ دوزانو بیٹھ جاتا۔ تسبیح کا ایک حصہ لے کر کلمہ خوانی میں شریک ہو جاتا۔ دور جاری رہتا۔ کوئی ضرورت مند آ گیا۔ عرض معروض کی۔ حضرت نے تسلی اور شفقت سے جواب دیا مگر ادھر کسی نے تعویذ گنڈے کا نام لیا اور آپ نے فرمایا، "میاں صاحب درویشی، رتالی اور منجمی کا نام نہیں کہ شاہ صاحب سجادے پر بیٹھے بیٹھے غیب کی خبریں مریدوں کو سنایا کریں۔ درویشی فقط قُربِ الٰہی کا نام ہے۔ اللہ والے مشکل کشائی اور حاجت روائی کی دکان نہیں کھولتے۔ نقش و عملیات کو معاش کا پیشہ نہیں بناتے۔ فقیری شعبدہ

بازی اور بھنڈیلے پن کا نام نہیں۔ اگر فقیری اسی کا نام ہے تو چوک پر جا کر دیکھ لو، میاں بھان متی اور میاں مداری کیا کیا اَن دیکھی دکھاتے ہیں۔ ہمیں اکابر کی کرامت اور خرقِ عادات کی حرص نہیں کرنا چاہیے۔"

ہر مہینے کی پندرہ کو محفلِ مراختہ ہوتی۔ شہر کے سارے ریختہ گو بارہ دری میں جمع ہوتے۔ باہم شعر خوانی ہوتی۔ اس محفل میں میر بھی ہوتے تھے۔ سودا بھی میر سوز بھی، شاہ جہاں آباد کے سارے خوش نوا کھنچے چلے آتے۔ اسی محفل میں خواجہ صاحبؒ نے شوریدہ سر، افسردہ دل، دیوانہ مزاج میر تقی میر کا کلام سن کر فرمایا تھا، "میر تو میر مجلس خواہی شد" یہی نہیں اپنی محفل بھی ان کے حوالے کر دی کہ یہ مشاعرہ تم اپنے یہاں کیا کرو۔ مرتبہ شناسی اور تالیفِ قلوب اسی کا نام ہے۔ چھوٹوں کا اعتبار یوں ہی بڑھایا کرتے ہیں۔ مرزا محمد رفیع سودا بڑے منھ پھٹ اور زباں دراز تھے۔ ان کی تیغ زبان سے کوئی نہ بچا مگر خواجہ صاحبؒ کی بزرگی کو وہ بھی مانتے تھے۔ چھیڑ چھاڑ کی خاطر صرف یہ کہہ کر چپکے ہو رہے:

اے بے ادب تو درد سے یوں دو بدو نہ ہو

ہر ماہ کی دوسری تاریخ کو خواجہ ناصر عندلیبؒ کی ماہانہ فاتحہ کے سلسلے میں بارہ دری میں محفلِ موسیقی منعقد ہوتی۔ بارہ دری میں اندر باہر دری چاندنی کا فرش ہوتا۔ شامیانہ لگتا، جھاڑ، فانوس، مردنگیوں میں شمعیں روشن ہوتیں۔ چراغوں اور مشعلوں کی روشنی الگ ہوتی۔ کورے کورے مٹکے، ٹھلیاں، جھجھریاں، صراحیاں پانی سے بھر کر رکھ دی جاتیں۔ بڑی دھوم اور قاعدے کی محفل ہوتی۔ خواجہ صاحب بذاتِ خود علم موسیقی کے ماہر، دلّی کے سارے باکمال موسیقار حاضر۔ اس محفل کی حاضری کو سرمایۂ افتخار سمجھتے۔ سارا شہر جمع ہو جاتا خواجہ صاحب محفل میں دوزانو تشریف فرما ہوتے۔ پاسِ ادب سے ہر شخص دوزانو۔ ایک دفعہ شاہ عالم ثانی، شہرہ سن کر محفل میں بن بلائے پہنچے۔ ہر چند کہ زبانِ خلق پر "سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم" کا آوازہ تھا مگر بادشاہ تو تھے۔ نام ہی کے سہی، رسّی جل جاتی ہے بل نہیں جاتا۔ محفل کے آداب نظر انداز کر کے پاؤں پھیلا کر بیٹھے، کہنے والے کہہ چکے ہیں "خدا کے واسطے اتنے تو پاؤں مت پھیلا۔" خواجہ صاحب بھی خواجہ صاحب تھے۔ برملا سر محفل ٹوک دیا:

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

بادشاہ نے پیر کے درد کے عذرِ لنگ کا سہارا لیا۔۔۔"دکھتے بہت ہیں آج "اسیر محن" کے پاؤں۔"خواجہ صاحب نے بڑی متانت سے فرمایا، "پیر میں درد تھا تو تکلیف کرنا کیا ضرور تھا۔"

محفلیں بھی جاری رہیں۔ باکمالوں کی ہجرت بھی جاری رہی۔ دلی کا روپ سروپ بگڑ رہا تھا۔ ایرانی، تورانی، روہیلے، جاٹ سب ہی اس دلہن کی مانگ ٹھنڈی کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ایک دور وہ تھا کہ ایران، توران کے طالع آزما، طالع آزمائی کے لیے دلی کا رُخ کرتے تھے یا اب یہ وقت آ لگا کہ دلی کے شرفا اور صاحبانِ کمال منھ چھپائے نظریں چرائے فرخ آباد، فیض آباد، مرشد آباد اور دکن بھاگے جا رہے تھے۔ سراج الدین علی خان آرزو چلے گئے۔ مرزا رفیع سودا، فرخ آباد نکل کھڑے ہوئے۔ میر نے رختِ سفر باندھا، در و دیوار پر حسرت سے نظر ڈالی اور:

خاک دہلی سے کیا ہم کو جدا یک بارگی
آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار

میر سوز، "اب جو کہے ہیں سوز سوز یعنی سدا جلا کرو" سوختہ ساماں برشتہ جگر شاہ جہاں آباد کو بے سوز کر گئے۔ قایم گئے، مصحفی گئے، نہیں گئے تو خواجہ میر درد۔ اُسی چیلوں کے کوچے میں، اپنے حجرے میں استقامت کا کوہِ گراں بنے بیٹھے رہے۔ انقلابات آتے رہے مگر "اپنی بلا سے بیٹھ رہے جب فقیر ہو":

موت کیا آ کے فقیروں سے تجھے لینا ہے
موت سے پہلے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں

خلقِ خدا کی حاجت روائی ہوتی رہی۔ فیض کا دریا بہتا رہا۔ ملفوظات بھی لکھی شعر و شاعری بھی، تصنیف و تالیف بھی، پندرہ برس کی عمر میں "اسرار الصلوٰۃ" لکھ کر انتالیس برس کی عمر میں "وارداتِ درد" کی تکمیل ہوئی۔ ایک سو گیارہ واردات ہیں۔ مقاماتِ معرفت و حقیقت رباعیات کے روپ میں، تشریحات و تعلیقات کے ساتھ۔ غنا کے بارے میں ایک رسالہ مرتب کیا۔ مریدوں اور عقیدت مندوں کے اصرار اور فرمایش پر ایک سو گیارہ واردات نے ایک سو گیارہ

رسالوں کا روپ اختیار کر کے "علم الکتاب" کا نام پایا۔ کتاب کیا ہے، مطالب حقّہ کا مرقع ہے۔ آیتوں اور حدیثوں سے مزین، چھ سو اڑتالیس صفحات پر پھیلا ہوا، اسرار و معرفت کا یہ دفتر خواجہ میر دردؒ کے علم ظاہر و باطن کا آئینہ اور معرفت کا گنجینہ ہے۔ زبان سلیس، پیرایہ نفیس، انوار، احوال، آثار سب کا نچوڑ یک جا، پڑھتے رہے غور کرتے رہو۔

علم الکتاب سے فارغ ہوئے مگر خیالات کا ہجوم اور معنی کا وفور وہی تھا، چناں چہ چار رسالے اور مرتب ہوئے۔ نالہ درد، آہ سرد، درد دل، شمع محفل۔ چوں کہ خواجہ ناصرؒ کے فرزند دل بند بھی تھے، مرید بھی تھے، عاشق بھی تھے۔ اس لیے چاروں رسالوں میں لفظ "ناصر" کے اعداد یعنی ۳۴۱ کا التزام کیا۔ نالہ درد میں بھی تین سو اکتالیس نالے، آہ سرد میں تین سو اکتالیس آہیں۔ درد دل میں تین سو اکتالیس درد اور شمع محفل میں تین سو اکتالیس نور ہیں۔ نور کیا ہیں، روشنی کی کرنیں کہ یکے بعد دیگرے پھوٹتی نظر آتی ہیں، پھلجھڑیاں ہیں کہ چاروں طرف پھول ہی پھول بکھیرتی ہیں مگر پھلجھڑی ایک لمحے کی بہار ہے۔ یہ بہارِ ابد قرار ہے اور پھر یہ التزام بھی کہ چاروں رسالوں میں جتنے بھی شعر لکھے ہیں سب اپنے ہی ہیں۔ یہ دور نثر میں اشعار کی بے تکلف آمیزش کا دور تھا۔ برجستہ اور برمحل اشعار کے بغیر نثر آگے نہیں بڑھتی تھی۔ خواجہ صاحب کا کمال یہ کہ بلیغ اور پُرکار اشعار ایسی خوبی سے جابجا چسپاں کیے ہیں جیسے نگینے جڑ دیے ہیں۔ نثر کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ معنویت میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ نثر کیا ہے گنجینۂ معنی کا طلسم ہے۔

نثر کی سجاوٹ کو تو جانے دیجیے۔ شمع محفل کے تین سو انتیسویں نور میں خواجہ صاحب نے یہ بھی لکھ دیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس فقیر کو یہ بشارت بھی ہو چکی ہے کہ "از سالِ ارتحال توازیں جہاں" اور "ازحال انتقال توازیں مکاں" پیشتر اطلاع و آگاہی ہو جائے گی۔ شمع محفل کا اختتام ہوا۔ "صفر کا مہینہ" ۱۱۹۹ھ سن کا خاتمہ امسال ہوا جو اس عاصی پر معاصی فقیر خواجہ میر محمدی المتخلص بہ درد کا سال انتقال بھی ہے۔ اس تحریر کو دیکھیے اور ۲۴ر صفر ۱۱۹۹ھ کو خواجہ صاحب کے وصال پر غور فرمایئے۔ لائق فرزند نے نیک نام باپ کی روایت پر عمل کیا۔ وہ بھی چھیاسٹھ برس کی عمر میں رخصت ہوئے۔ یہ بھی چھیاسٹھ برس کی عمر میں گئے کہ چھیاسٹھ اسم مبارک "اللہ" سے ہم عدد ہے۔ اولیاء اللہ کو اپنی رخصت کا علم ہوتا ہے، مشہور بات ہے۔

جہاں گیر نے اپنی تزک میں لکھا ہے "ایک دن کسی تقریب میں میرے والد نے شیخ سلیم چشتیؒ سے پوچھا کہ آپ کی کیا عمر ہوگی۔ آپ کب ملک بقا کو انتقال فرمائیں گے۔" "عالم الغیب خدا ہے۔" بہت پوچھا تو مجھ نیاز مند کی طرف اشارہ کرکے فرمایا۔ جب شاہزادہ اتنا بڑا ہوگا کہ کسی کے یاد کروانے سے کچھ سیکھ لے اور آپ کہے، جاننا ہمارا وصال نزدیک ہے۔ والد بزرگوار نے یہ سن کر کچھ تاکید کردی کہ جو لوگ خدمت میں ہیں نظم و نثر کچھ سکھائیں نہیں۔ اس طرح دو برس سات مہینے گزرے۔ محلے میں ایک عورت رہتی تھی۔ وہ نظر گزر کے لیے روز مجھے اسپند کر جاتی تھی۔ اسے کچھ صدقہ خیرات مل جاتی تھی۔ ایک دن اس نے مجھے اکیلا پایا۔ اس مقدمے کی اُسے کچھ خبر نہ تھی، مجھے یہ شعر یاد کروادیا:

الٰہی غنچۂ اُمید بکشا
گُلے از روضہ جاوید بنما

مجھے پہلے پہل یہ کلام موزوں ایک عجیب چیز معلوم ہوا۔ شیخ کے پاس گیا تو انھیں بھی سنایا، وہ مارے خوشی کے اُچھل پڑے۔ والد بزرگوار کے پاس گئے اور یہ واقعہ بیان کیا۔ اتفاق کہ اسی رات انھیں بخار ہوا۔ دم بدم ضعف بڑھتا جاتا تھا اور مرنے کے آثار ہوتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ محبوبِ حقیقی کا وصال حاصل ہوا۔"

یہ تو جہانگیر کا بیان تھا، خواجہ صاحب نے اپنے قلم سے اپنا سالِ ارتحال قلم بند کرکے اس خیال کی تصدیق کردی ہے کہ وہ حقیقت احوال سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اُن کی اس خصوصیت کا لحاظ کرکے اُن کے ایک شاگرد میاں ہدایت نے مصرع تاریخ بھی خوب لکھا ہے "حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب۔" مریدوں عقیدت مندوں، حاضر باشوں نے آخری وقت میں آپ سے سوال کیا، "اب ہماری راہ نمائی کون کرے گا۔" آپ نے فرمایا، "ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں":

تا قیامت نہیں مٹنے کا دل عالم سے
دردؔ ہم جاتے ہیں پر چھوڑے اثرؔ جاتے ہیں

یہ اشارہ تھا برادر اصغر خواجہ اثرؔ کی جانب جو خواجہ صاحب کے بعد ان کی مسند ہدایت پر فائز ہوئے۔ مثنوی "خواب و خیال" اُن کی پُراثر یادگار ہے۔ خواجہ محمد ناصر عندلیبؔ، خواجہ

میر دردؒ اور خواجہ میر اثرؒ تینوں ایک ہی جگہ پہلو بہ پہلو ابدی نیند سو رہے ہیں۔ درمیان میں خواجہ عندلیبؒ۔ سیدھے ہاتھ پر خواجہ میر دردؒ، بائیں پہلو پر خواجہ میر اثرؒ، ترکمان دروازے کے باہر جنوب کی جانب کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر بیرن روڈ اور ٹیگور روڈ کے مابین میر دردؒ روڈ کے متصل ایک باغیچی میں تینوں بزرگوں کے مزار ہیں۔ بائیس خواجاؤں کی چوکھٹ کا انداز بھی نرالا ہے۔ اس معمورے کے نام بزرگوں کے ناموں کی برکت سے معمور ہیں۔ قطب صاحبؒ ہے، بستی نظام الدینؒ ہے، چراغ دہلی ہے، انھیں خواجگانِ عظام کے دیار میں رائے سینا میں میر دردؒ روڈ اور چیلوں کے کوچے میں بارہ دری خواجہ میر دردؒ بھی فیض خواجگاں کا مظہر ہے۔

اردو ادب میں خواجہ صاحب اپنی شاعری کے حوالے سے ممتاز ہیں۔ شاعر تو وہ دراصل فارسی کے تھے اور زبردست شاعر تھے، غزل اور رباعی دونوں میں کمال رکھتے تھے مگر فارسی تو ہمارے لیے مرحوم و مغفور ہو چکی ہے۔ سمجھتا کون ہے۔ خواجہ صاحب شاعر ضرور تھے مگر اس انداز کے شاعر نہیں تھے جیسے میر تقی میر، مرزا رفیع سودا یا میر سوز تھے۔ ان لوگوں کے یہاں شاعری فن اور پیشے دونوں کی حیثیت رکھتی ہے۔ درباروں سے وابستہ تھے۔ قصیدے لکھ کر نذر گزرانتے تھے۔ انعام پاتے تھے۔ خواجہ صاحب کو اس دنیاداری سے کیا تعلق۔ یہاں تو یہ سلسلہ کہ دل پر کوئی کیفیت گزری شعر ہو گیا۔ اپنی شاعری کا حال علم الکتاب میں خود ہی یوں بیان کر دیا ہے۔ ”فقیر کے اشعار باوجود رتبہ شاعری کی رعایت کے و پیشہ شاعری اور اندیشہ شاعری کے نتائج نہیں۔ بندے نے شعر کبھی بدون آمد کے، اہتمام آورد سے موزوں نہیں کیا اور بہ تکلف کبھی شعر و سخن میں مستغرق نہیں ہوا۔ کبھی کسی کی مدح یا ہجو نہیں کہی۔ کبھی فرمائش یا آزمائش سے متاثر ہو کر شعر نہیں کہا۔“ لمبی لمبی غزلیں، قافیہ پیمائی، ہر زمین میں خاک اُڑانا، ان سب باتوں سے خواجہ صاحبؒ کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ شاعری ان کی بزرگ شخصیت کا ایک موثر اظہار تھی۔ فارسی کی طرح ان کا اردو دیوان بھی مختصر ہے۔ بہت سی غزلوں میں اشعار کی تعداد بھی کم ہے مگر مختصر دیوان کے باوجود خواجہ صاحب کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ کہنے والوں کا کہنا تو یہ ہے کہ قدیم اردو شاعری کے چار ستون ہیں۔ میر، سودا، خواجہ میر درد اور میر سوز۔ میر جیسے بد دماغ اور نازک مزاج جو بڑوں بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، خواجہ صاحب کی شاعری کے مداح تھے۔

خدا بخشے مولوی محمد حسین آزاد کے بقول لکھنؤ میں میر صاحب سے کسی نے پوچھا کیوں حضرت آج کل شاعر کون کون ہے۔ کہا، ایک تو سودا دوسرا یہ خاکسار ہے اور کچھ تامل کر کے کہا، آدھے خواجہ میر دردؔ"۔۔۔ مگر اسی آدھے شاعر کی تعریف کرتے کرتے میر صاحب کی زبان سوکھ گئی۔ انھوں نے شاعروں کا ایک تذکرہ مرتب کیا تھا۔ "نکات الشعرا" نام رکھا۔ اس تذکرے میں خواجہ صاحب اور ان کی شاعری کا بیان ایسی محبت و عقیدت سے کیا ہے جیسے کوئی خوش عقیدہ مرید اپنے پیرو مرشد کا احوال قلم بند کر رہا ہے۔ "نکات الشعرا" کے حوالے سے خواجہ صاحب آدھے نہیں پورے شاعر نظر آتے ہیں۔ میر کے عقیدت مندانہ بیان سے فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی کو گمان گزرا کہ میر صاحب، خواجہ میر درد کے شاگرد تھے مگر آزاد تو آزاد ہی تھے حکایت سنا گئے۔

خواجہ صاحب کا دیوان مختصر ہے۔ غزلیں ہیں، رباعیات ہیں، ایک آدھ مخمس اور ترکیب بند ہے۔ رباعیاں سب کی سب جوش و اثر میں ڈوبی ہوئی:

اے دردؔ یہ درد جی کا کھونا معلوم
جوں لالہ جگر سے داغ دھونا معلوم
گلزارِ جہاں ہزار پھولے لیکن
میرے دل کا شگفتہ ہونا معلوم

☆

ہم نے بھی کبھو جام و سبو دیکھا تھا
جو کچھ کہ نہیں ہے روبرو دیکھا تھا
ان باتوں کو اب جو غور کرے اے دردؔ
کچھ خواب سا تھا کہ وہ کبھو دیکھا تھا

خواجہ صاحب بزرگ تھے، صوفی تھے، درویش تھے۔ اس وجہ سے ان کی ساری شاعری کو تصوف کے حوالے کر کے صوفیانہ شاعری قرار دے دیا گیا۔ "جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔" کسی نے یہ نہیں سوچا کہ تصوف زندگی سے علاحدہ کوئی شے نہیں۔ پوری انسانی زندگی، عالم مثال اور عالم امکان پر محیط ہے، جو مجاز ہے وہ بھی حقیقت ہے جو حقیقت ہے وہ بھی مجاز ہے۔

دیکھنے والی آنکھ دیکھتی ہے۔ سب کچھ دیکھ لیتی ہے۔ جنھیں حس نہیں وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے۔ بال کی کھال نکالنے والوں نے خواجہ صاحب کی شاعری کے مطالعے میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی بحثیں چھیڑیں، بڑی بڑی تاویلیں فلسفے سے دلچسپی رکھنے والوں نے خواجہ صاحب کی تحریروں اور شاعری میں ایک مربوط فکری نظام کی جھلک دیکھی۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ خواجہ صاحب کی شاعری سے لطف اندوز ہونے والوں کو نہ اس بحث سے غرض نہ مجاز و حقیقت کے جھگڑوں سے سروکار۔ وہ تو جب یہ اشعار پڑھتے ہیں:

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے یاں اک تو ہی صاحب خانہ تھا
وائے ناکامی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

☆

تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے
جس لیے آئے تھے ہم سو کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

☆

گلیم بخت سیہ سایہ وار رکھتے ہیں
یہی بساط میں ہم خاکسار رکھتے ہیں
ہمارے پاس ہے کیا جو کریں فدا تجھ پر
مگر یہ زندگیٔ مستعار رکھتے ہیں

تو ان پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ سچی اور حقیقی

شاعری یہی ہے۔ کیف و اثر میں ڈوبی ہوئی، نکھری، نکھری، عاشقانہ بھی، عارفانہ بھی۔ اپنے عہد کی شعری روایت سے پوری طرح ہم آہنگ بھی۔ اُس پر خوش گوار اضافہ بھی، زبان میں سلاست، انداز میں مسکینی، شکوہ بھی ہے تو عاجزی اور دردمندی کے ساتھ:

سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما
اس طرف کو کبھو گزر نہ کیا

کیسی عاجزی اور مسکینی ہے، کہیں بار خاطر نہ ہو، کہیں ناگوار نہ گزرے:

ایک میں دل ریش ہوں ویسا ہی دوست
زخم کتنوں کے سنا ہے بھر چلے

اضطراب اور بے چینی کا بیان دردمندی اور حکایت کے پیرائے میں:

کچھ ہے خبر تجھے بھی کہ اُٹھ اُٹھ کے رات کو
عاشق تری گلی میں کئی بار گیا

نکھرا ہوا عارفانہ رنگ:

کچھ اور مرتبہ ہے وہ فہمید سے پرے
سمجھے ہیں جس کو یار وہ اللہ ہی نہیں

سادگی اور بیان کی پرکاری:

اس طرح جی میں سانس کھٹکے ہے
سانس ہے یا کہ پھانس کھٹکے ہے

صاحب سیر الاولیا امیر خوردؒ کا بیان ہے کہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی مجلسوں میں آخر آخر وہی خوشبو محسوس ہوتی تھی جو حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوبِ الٰہیؒ کی مجالس میں عام تھی۔ کٹ حجتی کرنے والے مبالغہ آرائی کہیں گے مگر عارف باللہ خواجہ میر درد کی شہادت بھی سن لیجیے:

بسا ہے کون ترے دل میں گلبدن اے دردؔ
کہ بو گلاب کی آئی ترے پسینے میں

میر کے بہتر نشتر مشہور ہیں۔ مگر خواجہ میر دردؔ کے چند ایسے اشعار دیکھ لیجیے جو ہم سب کی زبانوں پر ہیں:

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

☆

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کم نہ تھے کرّو بیاں

☆

تجھ سے مر جائیں گے تو مر جائیں
جان ہے تو جہان ہے پیارے

☆

جی کی جی میں رہی بات نہ ہونے پائی
حیف ہے اس سے ملاقات نہ ہونے پائی

☆

میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے
مری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا

☆

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں
زندگی بھی گر رہی تو نوجوانی پھر کہاں

☆

روندے ہے نقش پا کی طرح خلق یاں مجھے
اے عمر رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

☆

فرصت زندگی بہت کم ہے
مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے

☆

خواجہ صاحب کے یہاں انقلابِ زمانہ کی آہٹ، تباہی اور بربادی پر تاسف بھی ہے مگر صبر ورضاکے ساتھ:

حیف کہتے ہیں ہوا گلزار تاراج خزاں
آشنا اپنا بھی واں اک سبزہ بیگانہ تھا

شعر کاہے کو ہے ٹھنڈی سانس ہے، دل کی کسک کا بھرپور اظہار ہے:

آہ وہ وہ شخص جو دیتے تھے خبریں غیب کی
ڈھونڈتے پھرتے ہیں اُن کو لوگ وہ کیا ہوگئے

☆

جلتا ہے اب پڑا خس وخاشاک میں ملا
وہ گل کہ ایک عمر چمن کا چراغ تھا

اردو شاعری کے سدا بہار چمن میں ہزاروں خوش نوا ہیں کہ اپنی اپنی مدھر بولیاں سنا رہے ہیں مگر زبانِ خلق سے کوئی محفوظ نہیں رہا۔ کسی کو بد دماغ کہا گیا، کوئی زبان دراز ٹھہرا، کوئی شوخ ہنگامہ آرا قرار پایا۔ کسی کی شاعری میں پہلوانی کا طنطنہ سنائی دیا، کسی کی شاعری میں شوریدہ سری نظر آئی، کوئی عشق باز، کوئی شہ کا مصاحب، کہنے والوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے مگر آوازوں کے اس شور میں ایک تان لگانے والا ایسا بھی ہے کہ نام آتا ہے تو سر عقیدت سے جھک جاتے ہیں۔ نگاہیں نیچی ہو جاتی ہیں۔ یہ ہیں جو ہر فرد، خواجہ میر دردؔ۔ اگلے پچھلے، اپنے پرائے ان کے لیے ایک زبان ہو کر کہتے ہیں:

"ہے" قافلہ سالار طریق قدما درد
جوں نقشِ قدم خلق کو یہ راہ نما ہے ا

غلام ہمدانی مصحفی

رہنے دو پڑا مصحفیؔ خاک بسر کو
اس غم زدۂ بے سروساماں کو نہ چھیڑو

جھٹ پٹا ہو چلا تھا۔ نواب صاحب نے خواصی میں بیٹھے ہوئے مصاحب کی طرف دیکھا۔ ایک بڑے میاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا! "اما، یہ اُستاد تو نہیں؟ چہرا مہرا تو انھیں کا سا ہے۔ مگر حالت بڑی ناگفتہ بہ معلوم ہوتی ہے۔ استاد میر حسن کے انتقال کے بعد انھیں کو کلام دکھایا تھا۔" مصاحب نے دست بستہ عرض کیا، "قبلہ عالم کی نظر۔ واللہ عقاب ہے عقاب، قربانت شوم، کیا عرفانِ نظر ہے۔ اُستاد ہی ہیں مگر خدا معلوم کیا سانحہ گزرا ہے پہچان میں نہیں آتے۔ خمیدہ کمر، جھکے شانے، بے جان ہاتھ پیر، چہرے پر گردِ ملال، مضمحل اور نڈھال، ہیں تو استاد ہی۔" نواب صاحب نے اشارہ کیا۔ مہاوت نے ہاتھی روکا۔ جب ہاتھی بیٹھ گیا تو مصاحب اُٹھ کر دوڑا۔ ذرا دیر میں ان بڑے میاں کو لیے واپس لوٹا۔ نواب صاحب نے استاد کی بزرگی کا لحاظ کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں "تسلیم عرض کرتا ہوں" کہا۔ بڑے میاں ایک لمحے کو جھکے، نواب صاحب کو غور سے دیکھا اور پھر "کورنش بجالاتا ہوں" کہہ کر سلام کا جواب دیا۔ نواب صاحب نے پہلو بدلا، استاد بڑھے، اصحابِ فیل کے روبرو ہو گئے۔ نواب نے سلسلہ سخن کا آغاز کرتے ہوئے شکایتاً کہا واللہ استاد آپ کے دیدار کو آنکھیں ترس گئیں۔ نیاز مندوں سے یہ بے اعتنائی، یہ تو فرمایئے آج کل بود و باش کہاں ہے۔ شب و روز کے مشاغل کیا ہیں۔ یہ بے اعتنائی، یہ تو فرمایئے کیوں۔ استاد نے ٹھنڈی سانس بھری، بہت ٹھہر کر اپنا شعر پڑھ دیا۔

نہ انیس ہے نہ جلیس ہے نہ رفیق ہے نہ شفیق ہے
ہم اکیلے گھر میں پڑے رہے سبھی لوگ گھر کے چلے گئے

نواب صاحب نے اپنے سر کی قسم دے کر پوچھا تو صرف یہ بتایا کہ تنہا ہیں۔ بے سہارا ہیں فتنہ پردازی گردونِ و اثروں کا شکار ہیں۔ نواب، استاد کا یہ حال سن کر بہت مغموم ہوئے۔ بولے "استاد، افسوس آپ جیسا عالی مرتبت سخن فہم و سخن شناس مردم شناس نہ ہو۔ لکھنؤ جیسا مرکز شعر و سخن، ہر کوچہ وبازار میں آپ کی شعر گوئی کا غلغلہ۔ ہر محفل شعر و سخن میں آپ کے تلامذہ کا شہرا اور آپ تنہائی کا شکار۔ بے آسرا اور بے وسیلہ، صبح غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایئے۔ جو خدمت ممکن ہے بجالائیں گے۔ آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے" استاد کے چہرے پر روشنی سی پھیل گئی۔ سلام کر کے چپکے کھڑے رہے مہاوت نے ہاتھی بڑھا دیا۔

یہ استاد تھے، استادالاساتذہ 'میاں غلام ہمدانی مصحفی'۔ دریافت حالت کرنے والے شاگرد تھے نواب مرزا محمد تقی ہوسؔ۔ نواب صاحب کا ہاتھی بڑھ گیا۔ استاد آہستہ آہستہ چلتے رہے، سوچتے رہے۔ مرزا ہوسؔ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں، وہ بھی تو ایک دور تھا جب میں نے کہا تھا:

میں لکھنؤ میں زمزمہ سنجان شعر کو
برسوں دکھا چکا ہوں تماشائے شاعری
اے مصحفیؔ ز گوشہ خلوت بروں خرام
خالیست از برائے تو خود جائے شاعری

یا اب خود ہی تماشا بن گیا ہوں۔ پوری زندگی آنکھوں کے سامنے تھی۔ اکبرپور مضافات دہلی میں ایک موضع تھا۔ آباو اجداد کا وطن تھا۔ وہ دریابرد ہوا تو امروہے کو رونق بخشی۔ ابتدائی تعلیم و تربیت، شعر و شاعری کا آغاز۔ امروہے سے آنولے جانا۔ ٹانڈے میں نواب محمد یار خان کے دربار کی رونقیں۔ کیا رئیس تھا دل چلا، شعر و سخن کا دل دادہ، نقاشی اور مصوری کا فریفتہ۔ مصور عاقل خان سے درباری شعرا کا نفیس مرقع تیار کروایا تھا۔ کیسے کیسے سخن ور دربار میں تھے۔ قائم چاندپوری تھے۔ کس غضب کے جوہر شناس تھے۔ ضعیف ہوگئے تھے، نواب کے اشعار پر حسب دل خواہ اصلاح نہیں دے سکتے تھے۔ یہ خدمت میرے سپرد کر دی تھی۔ ایک ناتجربہ کار

نوجوان کو یہ اعزاز بخشا گیا تھا۔ فدوی لاہوری تھے جن کے حق میں مرزا رفیع مرحوم نے "بوم بقال" کی حکایت لکھ کر رسوائے خاص و عام کیا تھا۔ نعیم دہلوی تھے۔ کیا کیا لوگ تھے مگر کتنی جلدی آنکھوں سے او جھل ہو گئے، وہ منحوس سکرتال کی جنگ سب کچھ درہم برہم کر گئی نہ نواب رہے نہ محفل۔ پھر بے یار و مددگار، یکہ و تنہا، وہ لکھنو کا پہلا سفر۔ امید و بیم پیہم کا ایک برس۔ شجاع الدولہ کا زمانہ تھا۔ مرزا رفیع سودا سے ملاقات ہوئی تھی۔ روزگار کی کوئی صورت نہ نکلی ناچار پھر شاہ جہاں آباد واپسی۔ ہاتھی لاکھ لٹے مگر پھر بھی سوا لاکھ کا، پت جھڑ کے باوجود کیا بہار تھی، کیسے کیسے خوش گو رونقِ بزم تھے۔ میر صاحب قبلہ تھے۔ خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ تھے۔ حضرت میرزا مظہر جانجاناںؒ تھے۔ کیا لطف و کرم فرماتے تھے۔ ایک دفعہ اپنے اسم گرامی کی وجہ تسمیہ بیان فرمائی تھی، شاہ حاتم تھے، جس زمانے میں غریب خانے میں مشاعرہ ہوتا تھا اکثر بعد مغرب تشریف لاتے تھے۔ محفل میں بیٹھتے تھے، یار بے عدیل مرزا قتیل تھے۔ کیسی کیسی صحبتیں تھیں۔

اے مصحفی میں کیا روؤں ان اگلی صحبتوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ چکے ہیں

سب سے بڑھ کر پیر و مرشد، قبلہ و کعبہ فخر عالم و عالمیان محب النبی، فخر جہاں، حضرت مولانا فخر الدینؒ تھے۔ اجمیری دروازے میں غازی الدین خان کے مدرسے میں حضرت کے حلقہ درس میں شریک ہونے کے سعادت بھی حاصل ہوئی۔ زانوئے تلمذ بھی تہہ کیا۔ آستان پاک کے ارادت مندوں میں بھی شامل ہوا۔ کیا شان تھی، کیا تبحر تھا۔ کیا انکسار، فروتنی اور برگزیدگی تھی۔ سبحان اللہ میں نے کس عقیدت سے عرض کیا تھا۔

دل فخر دین دل پزیرے دارد
صاحبِ دل و آئینہ ضمیرے دارد
او را چہ غم مصایب دوران است
در دہر کسے کہ ہمچو پیرے دارد

ان کے سایہ عاطفت میں غم مصایب سے کوئی واسطہ ہی نہیں پڑا۔ کیا خوش گزران رہی۔ شاہ نیاز احمدؒ تھے۔ میزان انھیں سے پڑھی تھی۔ پاک نہاد بزرگ تھے۔ شعر و سخن سے کیسی دل

چسپی تھی۔ حمد، نعت منقبت خوب کہتے تھے۔

بڑے میاں راستہ چلے جاتے تھے۔ ذہن میں ایک کے بعد دوسری تصویر ابھرتی آرہی تھی۔ دلی کا بارہ سالہ قیام "کتنے دل چسپ تھے مرے دن رات۔" مگر دلّی خالی ہو رہی تھی۔ روزگار ختم ہو رہے تھے۔ تجارت کا شغل اپنایا تھا مگر کاہے کی تجارت۔ سُوت نہ کپاس۔ دن رات شعر خوانی ہوتی۔ گھر پر مشاعرہ کا اہتمام۔ اللہ کا احسان یہ کہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ دست سوال دراز نہیں کیا، گزر اوقات ہوتی رہی۔ ادھر اہلِ کمال تھے کہ ہوائے شوق میں اُڑے جا رہے تھے۔ لکھنؤ میں دولت کی گنگا بہہ رہی تھی۔ سب کے سب کھنچے چلے جا رہے تھے۔ مگر کس توقع پر جاؤں ایک بار گیا تھا منھ کی کھا کر واپس آیا پھر قصد کیا۔ کیوں کیا:

روندن میں ہم تو ہو گئے پامال مصحفیؔ
از بسکہ اس گلی میں ہوا جوش نقش پا

ایک ملنے والے تھے، غلام علی خاں۔ انھوں نے اکسایا۔ کیسے کیسے سبز باغ دکھائے، آپ کو کیا فکر ہے خدمت کے لیے بندہ حاضر ہے۔ قافلہ ترتیب دیا گیا، ان کے ساتھ روانہ ہوئے۔ پھر کیا ہوا، لکھنؤ پہنچتے ہی انھوں نے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔ کیسی دوستی اور کیسا تعلق۔۔۔ وہ گھبرا کر دلّی کی واپسی کا قصد، یار وفادار مرزا قتیل نے کیسی ڈھارس بندھائی۔ کیوں بھاگے جاتے ہو کیا راستہ ناپنے آئے تھے۔ وہاں کیا رکھا ہے، کچھ دن رہو سیر دیکھو۔ روزگار کی بھی کوئی نہ کوئی صورت نکلے گی اور اگر جانا ہی چاہو گے تو چلے جانا، جانے والے کو کون روک سکتا ہے۔ اللہ بھلا کرے محمد حیات بیتاب بلگرامی کا۔ کیسی مسافر نوازی اور غریب پروری کی۔ اس کا سلوک آج تک دل پر نقش ہے۔ اسباب اپنے گھر لے گیا کیسی خاطر تواضع کی کس محبت سے اپنے گھر مہمان رکھا۔

یہ شجاع الدولہ کا نہیں آصف الدولہ کا لکھنؤ تھا۔ نئی وضع نئی تراش خراش۔ نواب وزیر لکھ لٹ۔ جیسا راجا ویسی پرجا، گھر گھر شعر و شاعری کے چرچے۔ علم کا جوش، میر صاحب یہاں بھی اپنی ذات کے خول میں بند تھے مگر ان کی موجودگی بڑی غنیمت تھی۔ میر سوز، میاں جعفر علی حسرت، میاں جرأت کا دور دورہ تھا۔ انشا بھی اپنا رنگ دکھا رہے تھے۔ معاملہ بندی اور چونچلوں کا کیا رنگ تھا۔ کیسی کیسی زمینیں نکالی جا رہی تھیں۔ میاں جرأت اور حسرت نے اوّل اوّل کیسی سرد

مہری سے پزیرائی کی تھی۔ کیسی چہ میگوئیاں ہوئی تھیں۔ مشاعرے کا اعلان، مقابلے کی کیفیت، اس محفل میں اپنا کون تھا۔ سب غیر تھے چپکے بیٹھے رہے مگر شعر سُن کر سب سُن ہو گئے۔ پہلے سرگوشیاں ہوئیں پھر داد و تحسین کے ڈونگڑے برسنے لگے۔ حُضّار تو کیا در و دیوار پر وجد کا عالم طاری تھا۔۔۔ میر حسن ان ہی دنوں بیٹے کو لے کر آئے تھے۔ شاگرد کروا دیا تھا۔ کہتے تھے۔ مثنوی لکھ رہا ہوں اسے آپ سنبھالیے۔ آج وہی شاگرد مرثیہ گوئی کا ماہِ منیر ہے۔

دلّی چھٹ گئی مگر بخت بد نے ساتھ کہاں چھوڑا۔ غلام علی جیسا مخلص چھوٹ گیا۔ معاصر شعرا، میاں صاحب، میاں صاحب، کرتے منہ پر رام بغل میں چھری۔ بد قسمتی ہر محاذ پر دامن پھیلائے۔ شمس الدولہ قسمت، شہزادہ جواں بخت مرزا جہاں داد کے مختار عام تھے، دلّی سے معتقد تھے۔ پنڈ پڑ گئے، شہزادے کی مدح میں کچھ کہو۔ کیسے کیسے حیلے بہانے کیے "میاں قسمت ہم تو ازلی بدقسمت ہیں تقدیر کے بیٹے، تم مہربان ہو بھی گئے تو کیا ہو گا۔" یہ بھی کہا "نا بابا ہم سے بھٹئی نہیں ہو گی"، مگر آزر دن دل دوستاں، جہل است" قصیدہ بھی لکھا عید قریب تھی قطعہ تہنیت بھی لکھا۔ طے ہوا کہ عید کے دن بازیابی ہو گی مگر وہی بخت بد، وہ بھیڑ بھاڑ ہوئی خلق خدا کا وہ اژدہام کہ قصیدہ پیش ہی نہ ہو سکا۔ شہزادے سے آمنا سامنا ہوا قطعہ لے کر رکھ لیا۔ پھر وہ شہزادے ہی نہ رہے۔ بنارس چلے گئے مگر بھٹئی کی ذلت میں ہمیشہ کے لیے مبتلا کر گئے۔ پھر وہی خواری۔۔۔ وہی بے روزگاری۔ غریب الوطنی کا احساس، شعر و شاعری ہی سے دل کھٹا ہو گیا تھا۔ مزاج میں کیسی وحشت پیدا ہو گئی تھی۔ در و دیوار کاٹنے کو دوڑتے تھے۔ خانہ نشینی اختیار کی تھی۔ پہلی خانہ نشینی تھی۔

مصحفیؔ آج تو قیامت ہے
دل کو یہ اضطراب کس دن تھا

بارے محمد نعیم خاں ثابت جنگ کے ہاں ملازمت کی سبیل نکلی، لکھنؤ میں پہلی ملازمت تھی۔ خوش و ناخوش گزاری، تنخواہ کے لینے میں کیسے پاپڑ بیلنا پڑتے تھے۔

وہ جوان رعنا کا نجی مل صبا۔ کیا دیدار و نوجوان تھا۔ سعادت مند، ذہین، ہونہار، روشن طبع۔ کیا آمد تھی۔ طبیعت کیسی رسا تھی۔ دریا کی سی روانی، سمندر کا سا جوش۔ کس محبت سے اپنے ہاں لے گیا تھا کیسی خدمت کی۔ اس کا مرنا، پچیس برس کی عمر تھی۔ جانے کس کی نظر کھا گئی۔ دق

نے ایسا دق کیا کہ جان کھو بیٹھا۔

پردہ خاک میں سُو سُو رہے جا کر افسوس
پردہ رخسار پہ کیا کیا مہ تاباں لے کر

مہہ تاباں کہاں زندگی کی اندھیری رات ہے۔ استاد انھیں خیالات میں غلطاں پیچاں آگے بڑھ گئے۔

سب اُٹھے بزم سے اور اپنے اپنے گھر کو چلے
ولیک یہ نہیں معلوم ہم کدھر کو چلے

بڑبڑاتے ہوئے پیچھے لوٹے۔ اپنے کلبہ احزاں میں داخل ہوئے۔ نہ چراغ نہ بتی، فرش پر بورے بچھے ہوئے۔

میری نشست گاہ تو اکثر زمین ہے
مانند نقش پا مرا بستر زمین ہے

چاروں طرف دیکھا، چراغ روشن کیا، بتی کو اُکسایا، تھرتھراتی ہوئی ہلکی روشنی میں در و دیوار گریہ کناں نظر آئے۔ بے اختیار دل سے ہُوک۔ اُٹھی گھر، گھر والی سے ہوتا ہے گھر والی ہی نہیں تو گھر کیسا، کٹورے میں پانی انڈیلا سامنے رکھ لیا۔ پھر خیالات کے دریا میں بہہ نکلے۔ ایک اور شب ہجر:

شاہد رہیو تو اے شب ہجر
جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی

چار برس مرزا مینڈھو سرسبز کی رفاقت میں گزرے۔ کیا عالی خاندان رئیس تھے۔ کیا رکھ رکھاؤ تھا۔ کیسی عزت سے پیش آتے تھے۔ نو عمر تھے لیکن اہلِ کمال کے قدردان، کیا کیا محفلیں ہوئیں۔ اسی زمانے میں صاحبِ عالم مرزا سلیمان شکوہ وارد لکھنؤ ہوئے۔ بادشاہ کے بیٹے تھے، شاہی بوباس۔ لکھنؤ میں دلّی کا انداز پیدا کر دیا۔ شعر و سخن کی محفلیں سجنے لگیں۔ وہ سیّد انشا کا اصرار، چلو، چلو، تم بھی چلو، حضور کی محفل تمھارے بغیر ادھوری ہے۔ زبردستی کھینچ لے گئے۔ ان سے باتوں میں کوئی جیت سکتا تھا، چت بھی میری پٹ بھی میری۔ کیا طلاقت لسانی تھی، کیا زورِ

بیان تھا۔ اسی نے اسی نے ان کو ڈبویا۔ کیسا مناقشہ ہوا تھا۔ گردن والی غزل سے چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی تھی:

کیا جانیے کیا حال ہوا صبح کو اس کا
ڈھلکی ہوئی تھی شب ترے رنجور کی گردن

یہی غزل تھی، انشا نے زور آزمائی کی تھی۔ صاحب عالم نے بہ نفس نفیس جوابی غزل لکھی تھی۔ استاد شاگرد دونوں نے مل جل کر اعتراض کیے تھے۔

سب صاحبوں نے اس کو جو باندھا ہے تو کہیے
دیکھی ہے کسی نے بھی سقنقور کی گردن
اور دوسرے ہے لفظ بلور اس کو بھی احمق
کہتے ہیں زبردستی سے بلّور کی گردن
اور تیسرے ماہی کو جو ماہی پڑھتو ہو
ہاں اس پہ ہلے عقل کے معذور کی گردن

منتظر اور گرم نے کیسے کیسے جواب لکھے۔ کیا گرم لکھے کیا خوب لکھے۔ دونوں آتش کے پرکالے تھے۔

عرفی نے خموشی کو خموشی کہا ہے
اس سے یہ ہے ماہی سقنقور کی گردن
جامی کی زلیخا میں ہے بلور کی گردن
کس نسخے میں ہے خوشہ انگور کی گردن
ماہی کی اضافت میں جنھیں ہووے تامل
بے سر ہے وہ پھر ان کے سقنقور کی گردن

خوب خوب غزلیں لکھی گئیں۔ کیسے براق طبع شاگرد تھے۔ انشا کا منھ بند کر دیا۔ پندرھویں شب کو صاحب عالم کے یہاں پھر مشاعرہ ہوا۔ میاں جرأت اور میر اکبر علی اختؔر نے بڑھ کر گلے ملوایا تھا۔ بظاہر صلح صفائی ہوگئی تھی۔ مگر انشا کہاں ماننے والے تھے۔ میں نے جب یہ

غزل صاحبِ عالم کے حضور پیش کی تھی۔

زہرہ کی جب آئی کف ہاروت میں انگلی
ہاروت نے کی دیدہ ماروت میں انگلی

میرے مقطعے کو انشا نے کیسا بگاڑا تھا۔

تھا مصحفی یہ مائل گریہ کہ پس از مرگ
تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

اچھے بھلے اس مقطعے کو پھبتی سے بدل دیا:

تھا مصحفی کا نا تو چھپانے کو پس از مرگ
تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

کیسا ہنگامہ ہوا تھا۔ منتظرؔ اور گرمؔ نے کیا غزلیں لکھی تھیں۔ انشا نے سوانگ بھی نکالا تھا۔ اسی احمد نگر میں گاتے بجاتے۔ اُچھلتے کودتے مٹکتے تھرکتے۔ شہر کے ارزال اور ارجاف کو ساتھ لیے نازل ہوئے تھے۔ کوتوال کی پشت پناہی تھی شہزادے کی شہ تھی۔ مصحفیؔ مسکین کے سب درپے تھے۔ منتظرؔ اور گرمؔ نے تلواریں سونت لی تھیں۔ ادھر بھی جمعیت کچھ کم نہیں تھی بڑا کشت و خون ہوتا۔ کیسی تُو تُو تھنبو کی تھی۔ کوئی سنتا ہی نہیں تھا۔ سب آگ ہو رہے تھے بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا۔ یہ فقرہ کام کر گیا کہ آصف الدولہ شہر سے باہر ہیں۔ والی ملک کی غیبت میں خانہ جنگی کا ہونا میرے واسطے موجب بدنامی ہے۔ پھر جو قصیدہ آصف الدولہ کے حضور پیش کیا تو کیا ہوا۔ انشا کی ساری ہیکڑی نکل گئی تھی۔ نہ سخن وری رہی نہ سخن دانی۔ کس برتے پر تتّا پانی۔ شہر بدر کر دیے گئے تھے۔ الہ آباد چلے گئے تھے۔ اس فضیحت سے دل پر کیا کچھ نہ گزری۔ آنا جانا، ملنا جلنا، شعر و شاعری سب ترک۔ نہ کوئی روزگار نہ وسیلہ، یہ دوسری خانہ نشینی ہوئی۔ وحشت مزاج پھر عود کر آئی۔ وہ تو اللہ بھلا کرے منتظرؔ اور گرمؔ کا۔ پھر غریب خانے پر مشاعرے کی طرح ڈالی۔ وقت اچھا گزرنے لگا۔

استاد سوچتے جاتے تھے۔ واقعات، حالات، گزرا زمانہ آنکھوں میں پھر رہا تھا۔ منتظرؔ، وہ شیخ زادہ کاکوروی۔ کیا کڑیل جوان تھا۔ کیا طبع بلند رکھتا تھا۔ بڑے بڑے اساتذہ کو آرزو تھی کہ ان کے

حلقے میں شریک ہو کر ان کی عزت افزائی کا سبب بنے، کیا استاد پرستی تھی جان چھڑکتا تھا۔ تیس برس کی عمر بھی نہیں ہوئی کہ سل کی نذر ہو گیا اور سب سینے پر پتھر کی سل رکھے رہ گئے۔ گرم کیا گرم مزاج نوجوان تھا۔ کیا آن بان تھی، شاگرد ہونے پر کیسا فخر کرتا تھا۔

کہتا ہوں میں ریختہ جو ایسا
یہ فیض سخن ہے مصحفی کا

وہ بھی کالپی چلا گیا۔ سنتے ہیں وہاں سے دکن نکل گیا، ہمارے لیے جیتے جی مرحوم مغفور ہو گیا۔ وہی بد بختی، وہی بد نصیبی۔

جو ملا اس نے بے وفائی کی
کچھ عجب رنگ ہے زمانے کا

بڑے میاں اُٹھ کر ٹہلنے لگے، اپنا شعر پڑھتے رہے:

رکھ کے ہم زانو پہ جس وقت کہ سر بیٹھ گئے
یہ سمجھ لیجیو ہمسایوں کے گھر بیٹھ گئے

آنکھوں سے آنسو بہتے رہے، اس شبِ ہجر کی سحر کب ہوتی ہے۔

اے شب ہجر کہیں تیری سحر ہے کہ نہیں
نالۂ نیم شبی تجھ میں اثر ہے کہ نہیں

مرزا تقی ہوسؔ کے یہاں جاؤں یا نہ جاؤں۔ آخرالامر وہی خانہ نشینی وہی بدنامی، اسی خلجان میں صبح ہو گئی۔ دل پر جبر کر کے نواب کے ہاں حاضر ہوئے۔ ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ مشاعرے بھی ہونے لگے، مگر زیادہ عرصے یہاں بھی نہ رہ سکے۔

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا
ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا

عمر کے آخری برس اسی دردِ ناکامی میں گزر گئے۔

یارب شہر اپنا یوں چھڑایا تو نے
ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تو نے

میں اور کہاں یہ لکھنؤ کی خلقت

اے وائے یہ کیا کیا خدایا تو نے

۱۲۴۰ھ میں مصحفیؔ اس درد سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئے۔ زندگی بھر بے سروسامان رہے، مرنے کے بعد بھی یہی ہوا۔

مصحفیؔ کا نہ نشان پوچھو کہ مدت گزری

پائنتی گھس گئی تربت کا سرہانا نہ رہا

پائنتی اور سرہانا کیسا، تربت ہی نہ رہی مگر ہاں نام رہ گیا:

دنیا سے ہم چلے گئے ناچار مصحفیؔ

اک یادگار اپنا یہ دیوان رہ گیا

ایک دیوان نہیں پورے آٹھ دیوان اور

اے مصحفی شاعر نہیں پورب میں ہوا میں

دلّی میں بھی چوری میرا دیوان گیا تھا

تین دیوان فارسی کے۔ نثر میں ایک خودنوشت مجمع الفوائد، شعرا کے تین تذکرے۔ ''عقد ثریا''فارسی کے شاعروں کا، ''تذکرہ ہندی'' اور ''ریاض الفصحا'' اردو شاعروں کے۔ بڑا وقیع اور سیر حاصل علمی اور ادبی سرمایہ ہے۔ تینوں تذکرے انجمن ترقی اردو نے شائع کردیے ہیں جس کا جی چاہے دیکھ لے۔ شاہ حاتم میرزا مظہر جانجاناںؒ، خواجہ میر دردؒ، مرزا سودا اور میر صاحب کے لے کر خواجہ حیدر علی آتش اور شیخ امام بخش ناسخ کے چشم دید حالات اور کلام پر رائے ہے۔ منصفانہ اور سخن گسترانہ، انشا سے کیسی معرکہ آرائی رہی مگر ان کے حالات میں بھی انصاف اور دیانت کو مد نظر رکھا ہے۔ اشعار کا انتخاب آبدار، کلام پر رائے میں اعلیٰ تنقیدی جوہر کا اظہار۔ معاصرین کے کمالات کا بجا اعتراف۔ اُبھرتے ہوئے فن کاروں کے بارے میں صحیح اور حوصلہ افزا نقطۂ نظر۔ اردو شاعری کی تاریخ کا مطالعہ، میاں مصحفی کے تذکروں کے بغیر نامکمل ہے۔ مجمع الفوائد میں اپنے حالات لکھے ہیں۔ حق یہ ہے کہ گفتنی اور ناگفتنی کی یہ روداد بھی لکھ دی ہے تاکہ ان کے فن کا مطالعہ کرنے والوں کو ان کی مسکینی، بے چارگی اور احساسِ تنہائی کا صحیح اندازہ

ہو جائے۔ ان کے یہاں پردہ داری نہیں، حقیقت نگاری ہے۔ جس سے ملے بے غرضانہ ملے، محبت اور خلوص سے ملے۔ بزرگوں کی محفل میں سنجیدہ اور متین۔ برابر والوں میں محترم اور صدر نشین۔ تلامذہ میں ہر دل عزیز اور کمال آفرین، حلیفوں میں مجنوں وضع مسکین، حریفوں کے حق میں آہ آتشین، ساری زندگی دردمندی اور عاجزی میں گزر گئی۔ نہ ڈھنگ کا روزگار نہ دم بھر قرار۔ برسوں دلّی میں رہے۔

بعضوں کو گماں یہ ہے کہ ہم اہلِ زباں ہیں
دلّی نہیں دیکھی ہے زباں داں یہ کہاں ہیں

شاہ جہاں آباد میں ہم چشموں میں یہ اعزاز تمام گزری، دنیاوی اعتبار سے بے نیل مرام گزری مگر اس دیار سخن میں جہاں میر اور خواجہ میر دردؔ جیسے صاحبانِ کمال موجود تھے، میاں مصحفی نے بھی اپنا لوہا منوالیا۔ عمر عزیز کے بیالیس برس لکھنؤ میں گزرے۔ اچھے بھی گزرے بُرے بھی گزرے۔ طبیعت کی مسکینی نے مقبولِ خاص و عام بنایا مگر یہاں بھی وہ "بیکارم و باکارم چوں مد بحساب اندر" نوابوں کا ٹھسہ دیکھتے رہے۔ حریفوں کی دراز دستی، تلخ نوائی اور زہر چکانی کے عذاب سے گزرتے رہے اور دعائیں کرتے رہے۔

کچھ دیر ہے رہائی مرغ اسیر میں
جائے ابھی چمن سے نہ موسم بہار کا

مگر بہار کا موسم نہ رہا۔ مرغ اسیر رہا ہوا تو پت جھڑ شروع ہو چکی تھی۔

مصحفی اردو شاعری میں بڑا مرتبہ رکھتے ہیں مگر ان کا کلام کم پڑھا گیا ہے۔ یہاں بھی ان کی کم نصیبی آڑے آئی۔ وجہ یہ ہوئی کہ دوسرے شاعروں کی طرح ان کا کلیات زندگی تو کیا مرنے کے فوراً بعد بھی شائع نہ ہوا۔ بس انتخاب ہی شایع ہوتے رہے۔ انتخاب لاکھ ارفع و اعلیٰ مگر پھر انتخاب ہے۔ مجموعی تصویر کہاں سامنے آتی ہے۔ وہ تو خدا بھلا کرے مولانا نیاز فتح پوری کا کہ اپنے رسالے "نگار" کا ایک مصحفی نمبر شائع کر کے مصحفی کو از سر نو روشناس خلق کیا۔ ممتاز نقاد حضرت مجنوں گورکھپوری اور سخن پرور، سخن سنج، حضرت فراقؔ گورکھپوری نے اس نمبر کے لیے بڑے معرکہ آرا مقالے لکھے اور ایسے لکھے کہ بازیافت کا حق ادا کر دیا۔ افسر امروہوی مرحوم نے بھی

امروہے کی رعایت سے مصحفی اور شاگردان مصحفی پر بڑی مفید کتابیں مرتب کی ہیں۔ اب مصحفی کا کلیات بھی شائع ہو گیا ہے جس کی وجہ سے ان کا بیش تر کلام پڑھنے والوں کے سامنے آ گیا ہے۔

مصحفی غریب یوں بھی مارے گئے کہ ادبی مراکز کی اشرافیت نے انھیں بارہ پتھر باہر سمجھا۔ ادبی تاریخ کے داستاں طراز محمد حسین آزاد نے بڑی خوب صورتی اور سلیقے سے ان کی کردار کشی کی۔ مصحفی آزاد کے ہیرو انشا کے حریف رہ چکے تھے، اس لیے ان کے کمالِ فن، ان کی خلاّقی، ان کی طبیعت کی مسکینی سب کو تمسخر کا نشانہ بنایا گیا مگر بڑا فن کار ہمیشہ بڑا فن کار رہتا ہے۔ زمانہ ورق اُلٹتا ہے تو بڑے فن کار کے فن کا کوئی نیا پہلو سامنے آ جاتا ہے۔ وقت گزرتا گیا، زمانہ ورق پر ورق پلٹتا گیا، اپنے عصر کے بڑے بڑے نامی گرامی فن کار، گردِ روزگار میں دب گئے مگر مصحفی کی شخصیت اور فن کے نئے نئے پہلو سامنے آتے رہے اور ابھی نجانے کتنے پہلو اور نمایاں ہوں گے۔

رنگ و نور کا ایک طوفان ہے کہ مصحفی کے یہاں جلوہ گر ہے۔ "اے مصحفیؔ شانیں ہیں مری جلوہ گری میں" ان کی خصوصیت یہ ہے کہ امروہے سے دلّی آئے تو میر سودا، خواجہ میر دردؔ اور میر سوز کے نغمے فضا میں گونج رہے تھے۔ اردو شاعری ایک خوش گوار انقلاب سے گزر کر نکھر چکی تھی۔ میر و سوز سے پہلے بلکہ کسی حد تک ان کی شاعری کے آغاز میں ایہام گوئی کا زور تھا۔ ایہام گوئی یعنی شعر کی بنیاد ایسے لفظ پر رکھنا جس کے دو معنی ہوں، قریب اور بعید۔ الفاظ کی مناسبت سے ذہن قریب کے معنوں کی طرف منتقل ہو مگر شاعر کی مراد بعید معنی سے ہو۔ ہے نا لفظی ورزش اور صناعی؟ شاعری کیا ہوئی محض کاری گری ہوئی مثلاً:

لگا اس شوخ کی زلفوں کو جب میں منھ لگانے کو
کہا کیا آج تیرا من چلا ہے مار کھانے کو

زلف کے حوالے سے مار نہیں مقصد سزا ہے۔ من اور مار کا ابہام بھی قابلِ توجہ ہے۔ میر و سودا کے عہد میں شاعری نے اس کاری گری سے نجات حاصل کر لی۔ ایوانِ شاعری میں دل اور دلّی کی آواز گونجنے لگی، مغل حکومت دم توڑ رہی تھی۔ شہر برباد ہو رہا تھا۔ نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی مرہٹے، روہیلے، جاٹ فرنگی سب ہی دونوں دونوں ہاتھوں سے شاہ جہاں آباد کا سہاگ لوٹ

رہے تھے، شرفا پر عرصہ حیات تنگ تھا۔ ایسا عالم ہو تو دلوں پر مایوسی طاری ہو جاتی ہے۔ آواز میں رقت لہجے میں سوز، انداز میں مسکینی در آتی ہے۔ دل دنیا سے بیزار ہو جاتا ہے۔ زندگی کی بے ثباتی، کائنات کی بے رونقی کا احساس ہوتا ہے۔ مصحفی ایک تو خود طبعاً مسکین دوسرے یہ ماحول، دلی میں رہے تو اسی روز مرۂ شاہ جہاں آباد اور اسی طرزِ احساس میں ڈوب گئے۔

میں خستہ تمام ہو چکا اب
جا درد کہ کام ہو چکا اب
رکھا تہ خاک مصحفی کو
آرام تمام ہو چکا اب

☆

کیا کریں جا کے گلستاں میں ہم
آگ رکھ آئے آشیاں میں ہم

☆

یادِ ایامِ بے قراری دل
وہ بھی یارب عجب زمانہ تھا
حادثے ہوتے ہیں زمانے میں
اس قدر انقلاب کس دن تھا
مصحفی آج تو قیامت ہے
دل کو یہ اضطراب کس دن تھا

یہ مصحفی کا خاص انداز ہے، مسکینی، عاجزی، درد کی ہلکی سی کسک، چوٹ کھائے ہوئے دل کی آواز مگر تند و پر شور نہیں۔ میر صاحب کے لہجے سے بالکل مختلف۔ خواجہ میر درد کی آواز سے مختلف۔ یہ مضمون کی آواز ہے۔ سادہ، پُراثر، شیریں اور درد میں ڈوبی:

اور سب تجھ سے ورے بیٹھے ہیں
ایک ہم ہیں کہ پرے بیٹھے ہیں

پھٹ گیا جب سے گریباں تب سے
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں
شیشۂ مے کی طرح اے ساقی
چھیڑیو مت کہ بھرے بیٹھے ہیں
مصحفیؔ یار کے گھر کے آگے
ہم سے کتنے نکھرے بیٹھے ہیں

نکھرے تھے۔ دلّی سے لکھنؤ چلے گئے۔ میر صاحب مصحفیؔ سے کوئی سال بھر پہلے لکھنؤ پہنچے تھے۔ ستّرے بہتّرے تو نہیں خاصے ساٹھے پاٹھے تھے۔ مگر ماحول سے اثر قبول کرنا اُن کی فطرت کے خلاف تھا اور پھر اس عمر میں۔ سودا بھی ساٹھ برس کی عمر میں دلّی سے نکلے۔ فرخ آباد میں طویل عرصہ گزارا۔ پھر لکھنؤ پہنچے تھے۔ اُن کا رنگ پختہ ہو چکا تھا۔ مصحفیؔ نہ عمر کی اس منزل میں تھے نہ پختگی کی منزل میں تھے۔ وہ لکھنؤ میں۔ حسرتؔ، جرأتؔ، انشاؔ سے چراغوں کی چمک، پھولوں کی مہک، حسن بے حجاب کی رنگینی، نئے معاشرے کی لذت پسندی، شاعرانہ صنّاعی اور لفظی اختراعات۔ سب سے متاثر ہوئے۔ اسی رنگ میں رنگ گئے۔ محبوب کی عشوہ طرازی اور بانکپن کے مصور ہو گئے اور ایسے شعر کہنے لگے:

تنہا نہ وہ ہاتھوں کی حنا لے گئی دل کو
مکھڑے کے چھپانے کی ادا لے گئی دل کو
یاں لعل فسوں سازنے باتوں میں لگایا
دے پیچ اُدھر زلف اُڑا لے گئی دل کو

بقول آزاد، مصحفیؔ نے جب مشاعرے میں یہ غزل پڑھی تو میر صاحب بھی موجود تھے۔ سر اُٹھا کر دیکھا۔ مکرر پڑھنے کی فرمایش کی۔ میاں مصحفیؔ پھولے نہ سمائے، کہنے لگے، ”دیوان میں لکھ دوں گا کہ میر صاحب قبلہ نے یہ شعر دوبارہ پڑھوایا تھا۔“ یہ رنگ و نور کے بے حجاب معاشرے کی جمالیاتی جھلک ہے۔ دلّی میں یہ فضا کہاں تھی۔ شاید اسی وجہ سے میر صاحب متاثر ہوئے۔

یہ دور وہ تھا کہ امراؤ جان ادا تو ابھی پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ مگر ان کو وجود بخشنے والا ادارہ تیزی سے معاشرے پر چھا رہا تھا۔ عشوے چونچلے، اتراہٹ، آڑ اور بانکپن نے شاعری کا رُخ بدل دیا تھا۔ مگر مصحفی کی نرمی اور مسکینی نے انھیں دوسرے معاشرے کی طرح کھل کھیلنے سے بچا لیا۔ بہت بڑھتے ہیں تو یہ کہہ کر رہ جاتے ہیں۔

نکھرا ہوا کیا چہرہ اس آئینہ رو کا ہے
شعلہ ہے شرارہ ہے آتش ہے بھبھوکا ہے

☆

نزاکت عاشق و معشوق کی یکساں نہیں ہوتی
مری گفتار نازک ہے تری رفتار نازک ہے

☆

تھا سرخ پوش وہ گل شاید چمن کے اندر
شعلہ سا شب پھرے تھا سرو و سمن کے اندر

بات کیا ہے، "وقت کے ساتھ بدل جاتا ہے طرزِ احساس۔" کل کی بات ہے ململ کے اونچے کرتے بہار دکھاتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ انقلاب ہوا کہ کرتے اور قمیص دونوں نیچے ہو گئے۔ رنگینی آ گئی سفید پوشی کا بھرم نہ رہا۔ اب میر صاحب نے تو یہ کیا کہ صبر شکر کے ساتھ اونچا کرتا ہی پہنتے رہے۔ مزاج میں ضد اور غصہ تھا۔ کہنے لگے میں اپنی وضع کیوں بدلوں۔ بوڑھا ہو گیا ہوں۔ بڑھاپے میں نیا سوانگ۔ نیچی قمیص پہن لینے سے وہ مقلد کیسے ہو گئے۔ قمیص اونچی ہو یا نیچی جامہ زیبی جامے کی نہیں پہننے والے کی ہوتی ہے۔

مصحفی تمام اصنافِ سخن پر حاوی تھے۔ قصیدے بھی لکھے بڑی مشکل زمینوں میں دھوم دھام سے لکھے۔ مثنویاں بھی لکھیں ان کے عہد میں محب و محبوب کے دریا میں ڈوبنے کا ایک سانحہ پیش آیا تھا۔ میر صاحب نے اسے بنیاد بنا کر مثنوی دریائے عشق میں آگ ہی آگ بھر دی۔ مصحفی نے بھی بحر المحبت میں اس واقعے کو بنیاد بنایا۔ ان کے بیان میں نفسیات انسانی کا مطالعہ تو اس کمال کا ہے کہ پڑھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔ ہیروئن کو اس کے گھر والوں نے بدنامی رفع کرنے کے

خیال سے دریا پار بھیج دیا تھا۔ محالہ کشتی میں تھا۔ ہیرو بھی باحال تباہ پریشان ساتھ ساتھ تھا۔ ایک دایہ بطورِ محافظ لڑکی کے ساتھ تھی۔ کہانیوں کی روایتی کٹنی کی طرح۔ مکار حیلہ ساز۔ اس نے لڑکی کی جوتی نوجوان کو دکھا کر دریا میں پھینک دی اور چلائی ہاں۔ ہاں لینا۔۔۔ وہ جان ہار بے دھڑک دریا میں کود گیا اور غریق بحر محبت ہوا۔ اس سانحے کے کچھ دن بعد لڑکی گھر واپس آرہی ہے۔ وہی محافہ وہی کشتی وہی دریا وہی دایہ وہی دھیان۔ اول تو جب لڑکی دریا کنارے پہنچی تو

لب ساحل پہ جب کہ آ پہنچے

غرقہ بولا مری دعا پہنچے

مصحفی نے کس چابک دستی سے محض ایک مصرعے سے جوشِ محبت کی عکاسی کی ہے۔ اس دعا میں آرزو، حسرت، تقاضا سبھی کچھ ہے۔ محافہ کشتی میں رکھا گیا کشتی دریا میں اس مقام پر پہنچی جہاں نوجوان غرق ہوا تھا، لڑکی بذاتِ خود اسی کے تصور میں غرق ہے۔ اس کی نوجوانی اس کی محبت جاں نثاری سب کچھ یاد آرہا ہے۔ اپنی بدنصیبی پر افسوس ہو رہا ہے، کیسا چاہنے والا تھا محض ایک جوتی کے پیچھے کود گیا۔ جان دے دی۔ اس موقع پر مصحفی لڑکی کی زبان کہلواتے ہیں۔

کفش میں ایسی کیا کرامت تھی

کفش والی تو میں سلامت تھی

آرزومندی کا ایک پورا مرقع ہے۔ کیا حسرت ہے کیا بھرپور اظہارِ محبت ہے، ایسی نادرہ کاری مصحفی کے یہاں بہت ہے۔

مصحفی سراپا سخن تھے۔ ان کے لیے شعر کہنا ایسا ہی تھا جیسے ہمارے لیے باتیں کرنا۔ کس بلا کی آمد تھی، کیا جوشِ سخن تھا، اس مسکین بے نوا کو اللہ تعالیٰ نے کس غضب کی روانی عطا کی۔ نور کی گردن، حور کی گردن، بڑی مشکل زمین ہے۔ اس قادرالکلام نے اس زمین میں غزلیں نہیں پورا قصیدہ بھی لکھ دیا ہے۔ اس سادگی سے لکھ دیا ہے کہ پڑھتے وقت ہمیں زمین کی سنگ لاخی کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ پتھر کو پانی کرنا شاید اس کو کہتے ہیں۔

اردو شاعری کے نگار خانے میں شاعر تو بے شمار ہیں، بزرگ، باوقار دل کے تاروں کو چھو لینے والے، مگر استاد بہت کم ہوئے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر اچھا شاعر اچھا استاد ہو۔ میر صاحب

خدائے سخن تھے، مگر اصلاح دینے سے گھبراتے تھے۔ ان کا رنگ نباہنا بھی ہر کس و ناکس کا کام نہیں تھا۔ دوسرے کے رنگ کو جلا دینا ان کا مزاج نہیں تھا۔ بڑا استاد وہ جو اپنا رنگ شاگرد پر نہ تھوپے۔ اس کی انفرادیت اُجاگر کر دے۔ مصحفی اس اعتبار سے بھی یکتا اور منفرد ہیں، شاگرد کے جوہر کو پہچانتے تھے۔ اس کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ جوہر کو چمکاتے تھے، عیب و صواب سے آگاہ کرتے تھے۔ جتنے شاگرد انھیں میسر آئے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوئے۔ ان کے اکثر شاگرد بذاتِ خود استاد ہوئے۔ خواجہ حیدر علی آتش بھی شاگرد، ایک واسطے سے ناسخ بھی۔ مرثیہ گوئی کے آفتاب و ماہتاب میر خلیق اور میر ضمیر بھی۔ منتظر گرم، بیار، تسلی، ذکی، رنگین، صبا، ہوس۔ مرحوم افسر امروہوی نے شاگردان مصحفی کے بارے میں ایک پوری کتاب مرتب کر دی۔ سیکڑوں نام ہیں ہر ایک کا رنگ سخن الگ۔ استاد کے خصوصی طرزِ کلام سے ماورا۔۔۔ وہ جو مسکین تھا۔ زندگی بھر جھینکتا ہی رہا۔ مرنے کے بعد بھی نشانہ ستم تنقید و تنقیص رہا۔ وہی مسکین اردو شاعری اور ہر حساس قاری کو اتنا کچھ دے گیا ہے کہ پڑھے جایئے سر دھنیے جایئے۔ رچے ہوئے اعتدال کا شاعر مصحفی کے سوا اور ہے کون۔

غم دل کا بیان چھوڑ گئے
ہم یہ اپنا نشان چھوڑ گئے
صفحہ روزگار پر لکھ لکھ
عشق کی داستان چھوڑ گئے

خواجہ حیدر علی آتش

راویانِ سیف زبانانِ آتش مزاج، گرم نوایانِ حدت منہاج، محررانِ شعلہ خو، سوز وتب و تاب امتزاج نے آہِ آتش بار اور حرارت نصف النہار سے گلخنِ سینۂ سخن کو اس طور پر مشتعل کیا ہے کہ جب وزیر اعظم بہادر کی محل سرائے کی تعمیر مکمل ہوگئی، فرش فروش، جھاڑ، فانوس سے در وبام رشک بستانِ لندن وچین ہوگئے تو شبھ گھڑی اور نیک ساعت دیکھ کر ایک مصاحب عالی وقار، صاحب اعتبار نے کہ نواب وزیر کا معتمد خاص اور منہ چڑھا تھا دست بستہ عرض کیا، "اگر ایک جلسہ شاعرانِ نامی کا منعقد ہو اور سب صاحبان طرح میں غزلیں پڑھیں تو بڑی رونق بہم پہنچے اور چرچا اس کا دور دور ہو۔ از بسکہ پرورش سخنوران نامی اس سرکار کا ہمیشہ سے دستور ہے۔ تو پھر کیوں نہ آوازہ کلام نغز سے دولت کدہ سدا معمور ہو۔"

نواب وزیر کون، نواب معتمد الدولہ، آغا میر، سلطنت اودھ کے پہلے وزیر اعظم، وہی معتمد الدولہ جنھیں مرزا اسد اللہ غالب اپنا اُمید گاہ قرار دے چکے تھے:

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
طاقتِ رنجِ سفر بھی نہیں پاتے اتنی
ہجرِ یارانِ وطن کا بھی الم ہے ہم کو
لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی اُمید
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

شیخ امام بخش ناسخ کے مربی اور محسن، نواب نے کہ عاقل و دانا اور سرپرست اہلِ سخن کے تھے، مصاحب جاں نثار، وفا شعار کی رائے کو پسند فرمایا۔ ارشاد ہوا، اس بانکے ترچھے، سودائی

مزاج، آتش کو ہم نے کئی بار طلب فرمایا مگر وہ ازراہِ کبر و غرور نہیں آیا، اُسے بھی دعوت بھیجی جائے اور اگر وہ شریکِ جلسہ اہلِ سخن ہو تو کوئی شخص بھی داد و تحسین کا کوئی لفظ منھ سے نہ نکالے۔"

مشاعرے کا اہتمام ہوا، محل سرائے وزارت، محل سرا تھی، نو تعمیر خوش نما، مستحکم، چار اطراف میں اس کی زیبائش کی دھوم، عمارات لکھنؤ میں کالبدر فی النجوم، سراپا دارالسرور، جلسہ گاہ نور علیٰ نور، لکھنؤ کے سخن ورانِ گرامی جمع، اتنے میں گورے رنگ کا ایک شکیل، وجیہ، بدن کا چھریرا، رندانہ وضع کا مست مولا، آدھا سر منڈا ہوا، آدھے سر پر پٹے، نکے دار ٹوپی ایک پٹے بانکے۔ ہاتھ میں ڈنڈا اس میں سونے کا چھلا، کمرے میں کھانڈا، دڑاتا در آیا۔ چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں، "استاد ادھر قدم رنجہ فرمایئے۔ استاد ادھر تشریف رکھیے۔ استاد نے اِدھر دیکھا نہ اُدھر، تلامذہ کا پرے کا پرا پیچھے پیچھے تھا۔ انھیں کے جھرمٹ میں بیٹھ گئے مگر ایسے کہ لاکھوں من کے معلوم ہو رہے تھے۔ محفل میں شعر خوانی کا آغاز ہوا۔ پڑھنے والے خوب خوب پڑھے۔ حضور کا یہ حال کبھی واہ کبھی آہ۔ سماں بندھ گیا۔ ہوتے ہوتے استاد کی باری آئی۔ چوبدار نے اگلہ سامنے رکھا۔ اہلِ محفل کو تہدید نواب وزیر کی یاد آئی۔ استاد کہ بے خبر اس بندش قاطع سخن سے تھے۔ نواب وزیر سے مخاطب ہو کر پڑھنے لگے۔

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے
زمیں یاں کی چہارم آسماں ہے

نو تعمیر محل سرا کے در و بام نور و نکہت میں ڈوبے، موقع کا مطلع، نواب وزیر کے منھ سے بے اختیار واہ نکل گئی۔ واہ کیا نکلی دریا کا بند ٹوٹ گیا:

مری آنکھوں کے آگے آئے گا کیا جوش میں دریا
ہمیشہ صورتِ ساحل ہے یاں آغوش میں دریا

آوازہ تحسین اور غلغلہ داد و آفرین، از زمیں تا چرخ بریں بلند ہوا۔ دوست دشمن سب رطب اللسان، "سبحان اللہ خواجہ صاحب، کیا مطلع ارشاد فرمایا ہے۔ مطلع کیا ہے، بہتر از مطلعِ آفتاب ہے۔ دیوانِ حسن کا بیتِ انتخاب ہے، لاجواب ہے۔" خواجہ شعر پر شعر پڑھتے رہے۔

خدا پنہاں ہے عالم آشکارا
نہاں ہے گنج ویرانہ عیاں ہے
دلِ روشن ہے روشن گر کی منزل
یہ آئینہ سکندر کا مکاں ہے
تکلف سے بری ہے حسنِ ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے
شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ
قناعت بھی بہارِ بے خزاں ہے

اہلِ بزم محسوس کر رہے تھے کہ مطربِ فلک دائرہ بدست محو غزل خوانی ہے۔ یہ صدائے سخن نہیں معجز بیانی ہے۔ نواب وزیر نے بے اختیار چوبدار خاص کی طرف نگاہ کی۔ چوبدار ملازم قدیم، نگاہ شناس، آن کی آن میں خلعت فاخرہ لیے حاضر ہوا۔ خواجہ صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ جیسے بیٹھے تھے بیٹھے رہے۔ لمحے بھر کے لیے بھی نگاہ اُٹھا کر نہ دیکھا، قناعت کی بہار بے خزاں کا تماشا دیکھتے رہے۔

خواجہ محفل سے اُٹھے تو شاداں و فرحاں تھے۔ دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ آج حریف کو سر میدان نیچا دکھایا۔ دوبدو اور روبرو میں اللہ نے کیسی آبرو رکھی:

رہے گی معرکے میں آتش آبرو تیری

کہنے کو تو کہا تھا مگر کل کا کہا آج سچ ہوا۔ خواجہ سوچتے رہے۔ گزرے ہوئے واقعات یاد آتے رہے۔ سارا ماضی آنکھوں میں سمٹ آیا۔ والد ماجد خواجہ علی بخش کا خیال آیا۔ کیا درویش مزاج بزرگ تھے۔ پاک نہاد، پاکیزہ روح، قدسی صفات، فیض آباد میں مغل پورے میں اقامت گزینی، بوریا نشینی، ان کے سائے کا سر سے اُٹھنا، دربدر ہونا، مغل بچوں کی صحبت میں دن رات کا اُٹھنا بیٹھنا، بات بات پر تلوار کھینچنا، سیکڑوں چڑ کے کھائے، سیکڑوں ٹانکے لگے، نہ تلوار مارنے میں عار نہ تلوار کھا کر شرمسار، دن رات اکڑنا، بنا، بررنا، اینٹھنا، نواب میر تقی تقی کی ملازمت، شیخ امام بخش کہ اب سخن وران سلف کے کلام پر خط تنسیخ پھیر کر ناسخ ہوگئے ہیں اسی سرکار سے وابستہ

تھے۔ کیسے کیسے میدان مارے، کیا ہنگامے رہے۔ نواب صاحب بنگلے سے عازمِ لکھنؤ ہوئے تو ہم بھی ہم رکاب و وابستۂ دامن نواب تھے۔

پھر زندگی کا نیا دور، نیا شہر، نئی تراش خراش، ہر طرف غلغلۂ سخن، کلام نغز سے فضا اور ماحول روشن، وہ شاعری کا شوق، کتب بینی کا ذوق، اہل علم کی جوتیاں سیدھی کیں، فنِ سخن میں کمال کا جوش و استاد الاساتذہ میاں غلام ہمدانی مصحفی کے آستانے پر لے گیا۔ کیا صاحبِ کمال تھے۔ آوازہ ان کے سخن اور استادی کا از شام تاروم مشہور ہر مرز و بوم تھا۔ وہ حلقہ تلامذہ میں داخل ہونا، استاد کی نگاہ میں وقار حاصل کرنا، شعر و شاعری کے چرچے، بانکپن کے نقشے، شاعری اپنی جگہ شمشیر زنی اپنی جگہ۔

خواجہ حیدر علی سوچ رہے تھے، ماضی آئینے کی طرح روشن ہوتا جاتا تھا:

دلِ روشن ہے روشن گر کی منزل

یاد آتا رہا، شعری ماحول میں صلابت تھی، سنگ لاخ زمینیں، طویل غزلیں، کڈھب قافیے، صرافانِ سخن نقدِ کلام پرکھتے۔ شعر اکاوش میں جانیں لڑاتے۔ طرح ہوئی، کفن بگڑا، چلن بگڑا، کیسی کاوش سے غزل کہی تھی۔ کیا محنت کی تھی، استاد کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کی۔ ارشاد ہوا پڑھو، اشعار پڑھے جانے لگے:

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک
نہ اک مو کم ہوا اپنا نہ اک تار کفن بگڑا
لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں تو خیر بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

استاد اظہارِ خوشنودی میں سر ہلاتے رہے۔ یہاں مزاج میں شوریدہ سری، بے جھجھک کہہ دیا، "استاد اس ردیف قافیے میں کوئی یہ شعر نکالے تو کلیجہ نکل پڑتا ہے۔" استاد تحمل کا کوہِ گراں تھے۔ بے جا لن ترانی سن کر پی گئے۔ ہنس کر کہنے لگے، "ہاں میاں، سچ کہتے ہو۔ اب تو کسی سے ایسے شعر نہیں ہو سکتے۔" ایک نو مشقا، مبتدی سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی غزل بناتے رہے۔ مشاعرہ ہوا تو اس نے پڑھا:

لکھا ہے خاکِ کوئے یار سے اے دیدہ گریاں
قیامت میں کروں گا گر کوئی حرف کفن بگڑا
نہ ہو محسوس جو شے کس طرح نقشے ٹھیک اُترے
شبیہ یار کھنچوائی کمر بگڑی دہن بگڑا

حاضرین نے میرے جلانے کو کیسی داد و تحسین کی تھی۔ برا ہو شوریدہ سری کا، وہ میرا جست کرنا، استاد کے پاس جاکر کہنا، "یہ آپ ہمارے کلیجے میں چھریاں مارتے ہیں۔ نہیں تو اس لونڈے کا کیا منہ تھا جو ان قافیوں میں یہ شعر نکالتا تھا۔" لوگوں نے کیسے ہائیں ہائیں کی تھی۔ کیا ناسمجھی کا دور تھا۔ استاد کے منہ آنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ آج یہ سب سوچ سوچ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

پھر شیخ امام بخش ناسخ سے دن رات کی معرکہ آرائی۔ اِدھر صرف زورِ کلام، قوتِ سخن، اُدھر تن و توش، ہوش و گوش، معتمدالدولہ کی سرپرستی، ہُنہ، محمد بخش خیمہ دوز کے لے پالک، غلام ابن غلام ابن غلام، رنگت میں اُلٹے توے، آدمی کی جون میں ارنے بھینسے، شہر بھر دُم کٹے بھینسے کی پھبتی کستا تھا۔ منہ پر شیخ صاحب، شیخ صاحب، اِدھر پیٹھ مڑی اور وہی دُم کٹا بھینسا۔ کیسی کیسی چوٹیں چلی ہیں۔ ہم طرحی غزلوں میں کیا کیا مقابلے رہے ہیں۔ ہر مشاعرے میں اپنی ہی غزل سرسبز ہوئی۔ حریفوں کی روح قبض ہوئی۔ غزلوں پر غزلیں لکھی جانے لگیں تو شیخ نے اپنی دانست میں بڑی چوٹ کی تھی۔

ایک جاہل کہہ رہا تھا میرے دیواں کا جواب
بو مسیلم نے لکھا تھا جیسے قرآں کا جواب

اُدھر سے ایسا دنداں شکن جواب ہوا کہ سناٹا چھا گیا۔ منہ کی کھائی، کچھ بن نہ آئی، کیسے مزے میں کہا تھا:

کیوں نہ دے ہر مومن اس ملحد کے دیواں کا جواب
جس نے دیواں اپنا ٹھہرایا ہو قرآں کا جواب

اُستاد یہ سب سوچتے سوچتے گھر پہنچ گئے۔ گھر کیا، نواز گنج کے قریب چوپٹیوں سے آگے

مادھولال کی چڑھائی سے اُترے۔ ایک چھوٹا سا مکان، چھپر پڑا ہوا، ایک چھوٹا سا باغیچہ، کمرے میں نرکل کی چٹائی، چھوٹا سا کھٹولا جائے نشست، شاگرد نرکل کی چٹائی پر بیٹھتے۔ خواجہ ہر ایک سے بے غرض ملتے۔ شاہی دربار سے جو وظیفہ ملتا، دو چار دن میں اُڑ جاتا۔ دعوتوں کی نذر ہو جاتا۔ فاقوں کی نوبت آجاتی تو ڈنڈے کا طلائی چھلا بنیے کی دکان پر پہنچ جاتا۔ کسی سے کچھ کہنا اُن کے مزاج کے خلاف تھا۔ شاگردوں کو خبر ہوئی، دوڑے آئے، خدمت کرتے مگر خواجہ صاحب کے تیہے سے ڈرتے رہتے۔ ایک روز کہ یہی پیمبری وقت تھا کسی نے فقیر محمد خاں گویا کو خبر دی۔ گویا صرف بزمِ سخن کے گویا نہیں تھے۔ خدمت بزرگاں کو بھی سعادت سمجھتے تھے۔ فوراً آ پہنچے، دیکھا تو دروازہ بند، دستک دی۔ آتش نے اندر سے پوچھا کون؟ گویا بولے "فقیر" آتش نے چلّا کر کہا، "فقیر کا میرے یہاں کیا کام، آج خدا مہمان ہے۔" دروازہ نہیں کھلا۔ گویا بے نیل مرام واپس ہو گئے۔ اگلے دن پھر پہنچے۔ بڑی مشکل سے دروازہ کھلا۔ استاد کی خدمت میں پہنچے۔ آتش کا کم سن بیٹا پتنگ اُڑا رہا تھا۔ گویا نے اسے پاس بلایا۔ سر پر ہاتھ پھیرا، پتنگ ڈور دیکھی، کہنے لگے، "میاں صاحب زادے یہ کنکوا تو اچھا نہیں۔ کنی لیتا ہوگا۔ ڈور بھی اچھی نہیں سَتی ہے۔" یہ کہہ کر روپے کی تھیلیاں سامنے رکھ دیں۔ بولے، "لو میاں! اس کا ڈور کنکوا منگوا لینا۔"

آتش سدا کے جلے تن تھے۔ آگ بگولا ہو گئے۔ کہنے لگے، "واہ خاں صاحب واہ۔ بجائے اس کے کہ آپ لڑکے کو ڈانٹتے، منع کرتے کہ میاں بھلا یہ شریفوں کے شغل اشغال ہیں۔ الٹی شہ دے رہے ہیں۔" یہ کہہ کر تھیلی میں سے پانچ روپے نکال کر لڑکے کو دے کر کہا، خاں صاحب کو سلام کر و اس کی چیز کھانا۔ باقی روپے واپس کر دیے۔

مزاج میں وحشت تھی مگر انصاف بھی تھا۔ دوسرے کے کمال کی قدر کرتے تھے۔ فیض آباد میں مشاعرہ ہوا۔ بطورِ خاص، بلائے گئے۔ میر مستحسن خلیق نے مطلع پڑھا:

رشک آئینہ ہے اس رشک قمر کا پہلو
صاف ادھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

آتشؔ نے اپنی غزل پھاڑ دی، کہنے لگے، "جب ایسا شخص یہاں موجود ہے تو میری کیا ضرورت ہے۔" اس زمانے میں عام دستور تھا کہ مشاعرے میں ایک قافیہ لازمی قرار دیا جاتا تھا۔

تمام شعرا اسے نظم کرتے تھے۔ مقابلے کی سی کیفیت ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ طرح ہوئی، زوال نہیں، حال نہیں، اس میں بول چال، لازمی قافیہ تھا۔ فضل احمد کیف نے غزل کہی، آتش کو سنائی، انھوں نے لازمی قافیہ سنا۔

کسی نے باغ میں ایسا شگوفہ چھوڑا ہے
کہ آج تک گل و بلبل میں بول چال نہیں

آتش بڑے خوش ہوئے، بڑی تعریف کی، کہنے لگے، "اب کی بار غزل تمھیں پڑھنا۔ خوب قافیہ کہا ہے، میں نہ پڑھوں گا۔"

مست الست ہونے کے باوجود معترضوں کو دنداں شکن جواب بھی دیتے تھے۔ ایک دفعہ مشاعرے میں مطلع پڑھا:

دختر رز مری مونس ہے مری ہمدم ہے
میں جہاں گیر ہوں یہ نورجہاں بیگم ہے

معترض نے کہا، "حضور بیگم ترکی زبان کا لفظ ہے اور بیگم نہیں بیگُم ہے۔" بولے، "ہاں جب ہم ترکی جائیں گے تو بیگُم ہی کہیں گے۔ یہاں بیگم ہی فصیح اور صحیح ہے۔" استادِ زبان تھے۔ معمولی فقرے میں آفاقی لسانی اصول کی نشان دہی کر گئے۔ جو لفظ جس زبان میں آگیا اُسی زبان کے تلفظ اور محاورے سے استعمال ہوگا۔ اصلیت سے بیگانہ ہو جائے گا۔ انگریزی میں ترکی سے گیا۔ اہلِ فرنگ نے GUM لکھا مگر ہم نے گم ہی پڑھا کم نہیں کیا۔ اپنا اپنا محاورہ ہے۔

ایک لفظ عام بول چال میں "نمش" بولا جاتا ہے۔ دودھ کے جھاگ میں مصری ملا کر بیچتے ہیں۔ قلفیاں بناتے ہیں۔ دولت کی چاٹ ہے۔ دولت کی چاٹ ہے کی صدا لگاتے ہیں۔ صحیح لفظ تو نمشک ہے مگر بچے بوڑھے ادنیٰ اعلیٰ سب نمش کہتے ہیں۔ بیچنے والے صبح سویرے اور شام کو بیچتے پھرتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے محاورہ عام کے مطابق نمش ہی نظم کیا:

اس خوان کی نمش کف مار سیاہ ہے

نکتہ چیں نے حرف گیری کی۔ انھوں نے اپنا اصول دُہرا دیا۔ فارس میں نمشک ہی کہیں گے، یہاں سب نمش کہتے ہیں تو نمش ہی شعر میں باندھنا چاہیے۔

سارے شہر میں دو گروہ تھے۔ ایک آتش اور ان کے تلامذہ کا گروہ دوسرا گروہ ناسخ اور ان کے متبعین کا۔ آتش درویش، قناعت پسند، عزلت گزیں۔ ناسخ حکام رس، صاحب ثروت، ہوا کا رُخ پہنچاننے والے، بارگاہِ وزارت کے حاشیہ نشین، شاگرد کو غریب اور ضرورت مند دیکھتے سفارش کر کے کہیں ملازم رکھوا دیتے۔ آتشؔ کے یہاں فقط اللہ کا نام۔

ایک دن غازی الدین حیدر نے کہ معتمد الدولہ کی فراست اور صاحبانِ فرنگ کی کمک سے نواب وزیر کے بجائے بادشاہ ہو کر جز رس باپ سعادت علی کے جمع کردہ چودہ کروڑ روپے کے خرچ کی نت نئی تدبیریں کرتے رہتے تھے۔ معتمد الدولہ سے دریافت کیا، "ہمارے شہر میں نامی شاعر کون کون ہے۔" معتمد الدولہ نے دست بستہ عرض کیا۔ "شاعر تو بے شمار ہیں لیکن ان میں شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش عالی وقار، سخن ورانِ صاحب اعتبار، مشہور ہر دیار و امصار ہیں" ارشادِ عالی ہوا، "اچھا، دولت سرائے شاہی میں مشاعرہ منعقد کیا جائے۔ دونوں طلب ہوں۔" معتمد الدولہ نے شیخ سے مشورت کی۔ انھیں کی تجویز سے تاریخ اور طرح طے ہوئی۔ جب مشاعرے میں صرف ایک دن رہ گیا تو بارگاہِ وزارت کا چوب دار رقعہ طلب آتش کو پہنچا گیا۔

رقعہ دیکھ کر آتش شعلہ جوالہ کی طرح لہرانے لگے۔ بولے، "معتمد الدولہ نے اچھا سلوک کیا۔ اب یہ شہر ہمارے رہنے کے قابل نہیں رہا۔" گھر کہلا بھیجا "صبح کچھ شگون کی روٹی پکوا دینا۔ ہم کچھ دن کے لیے شہر چھوڑ جائیں گے":

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے
نہ بدرقہ ہے نہ کوئی رفیق ساتھ اپنے
فقط عنایت پروردگار راہ میں ہے
مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے
خدا تو دوست ہے دشمن ہزار راہ میں ہے
تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتشؔ
گل مراد ہے منزل میں خار راہ میں ہے

صبح کے وقت سنہری برج میں مرزا محمد تقی اور مرزا حیدر بیٹھے خدائی آمد و رفت کی سیر دیکھ رہے تھے۔ انسانوں کی ایک موج تھی کہ رواں تھی۔ اچانک مرزا تقی نے مرزا حیدر سے کہا، "اما نواب"۔ "استاد"، مرزا حیدر بولے۔ "اما کچھ بیدھے ہوئے ہو۔ بھلا استاد کہاں۔ غور سے دیکھا تو واقعی استاد۔ یکہ و تنہا، نہ تلامذہ کا غول نہ سخن فہموں کا جمگھٹ، نہ بانکپن کی ادا، استفسار حال کے لیے چوبدار دوڑایا۔ آتش کہنے لگے، "ہماری دعا کہنا، ہم سفر کو جا رہے ہیں" مرزا تقی بمجرد سننے اس خبر کے بوچے پر سوار خود حاضر خدمت ہوئے۔ سارا حال دریافت کیا۔ کہنے لگے، "استاد آپ کیوں فکر مند ہیں، پان سے بانکا پچاس پچاس روپے ماہوار پر میرے پاس ملازم ہے۔ یہ کس کام کا ہے۔ اگر معتمد الدولہ نے ذراہٹ دھرمی اور آنا کانی کی تو واللہ خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ دنیا تماشا دیکھے گی۔ آپ دل پر میل نہ لایئے۔ غزل کا انصرام فرمایئے۔ باقی سارے کام خدام پر چھوڑیے۔"

مرزا نے استاد والا نژاد کی جانب سے ایک درخواست قلم بند کی۔ "حضور پُر نور! فقیر گوشۂ نشین کو یاد فرمایا ہے تو یہ اجازت بھی مرحمت ہو کہ سب سے پہلے غزل عرض کروں اور خاص گڑگڑی مرحمت ہو۔" درخواست ہاتھوں ہاتھ محل میں پہنچی۔ بادشاہ نے بھی ازراہِ عنایت دست خط فرما دیے۔ شہر میں شہرا ہو گیا:

کل ہمارا اور اس کا امتحاں ہو جائے گا

آشنائی کا تری دم تو بھرے بیگانہ آج

شام ہوتے ہوتے سارے شاگرد جمع ہو گئے۔ نواب غضنفر الدولہ، نواب مہدی علی، نصرت یار خاں، نواب سیّد محمد رند، خلیل، صبا سب موجود، اتنے میں خبر آئی، ناسخ اور ان کے شاگرد مشاعرے میں پہنچ گئے۔ آتش بھی عازم دولت سرائے شاہی ہوئے۔ بانکوں کی دھج تن پر ایک تہبند۔ آدھا باندھا، آدھا اوڑھے، ننگے سر، ننگے پیر، کمر سے کھانڈا باندھے۔ جلو میں تلامذہ۔ ان کے پیچھے پان سے بانکا کمر سے تلوار لگائے۔ یہ غول کا غول محل سرائے میں داخل ہوا۔ صدر بارہ دری کے اندر شہ نشین پر کرسی جواہر نگار، اس پر شاہ عالی وقار۔ غازی الدین حیدر بہ آب و تاب شاہانہ، دائیں بائیں اراکین سلطنت اپنے اپنے قاعدے سے استادہ۔ آگے چلمن، بارہ دری

کی بغل میں داہنی طرف شیخ اور ان کے شاگرد، بائیں آتش کے لیے خالی بیچ کا درجہ علاقہ ممنوعہ، آتش اور مرزا تقی دندناتے ہوئے بیچ ہی میں پہنچے۔ چوبدار ہائیں ہائیں کرتا ہی رہ گیا۔ "حضور یہاں بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔" سب نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ آتش نے آداب شاہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے بلند فرشی سلام کیا۔ سامنے بیٹھ گئے۔ عرض کیا، "حضور ایفائے وعدہ۔"

بادشاہ نے ایک خواص کی طرف دیکھا۔ وہ خاص گڑگڑی لے کر حاضر ہوا۔ آتش نے پھر دست بستہ سلام کیا۔ کہا، "اجازت۔ غزل پیش کی جائے۔" بادشاہ نے "ہوں" کیا۔ آتش گڑگڑی لے کر مشاعرے کے پینترے سے بیٹھے۔ غزل شروع کی۔ غزل کیا تھی۔ مضامین عاشقانہ، عارفانہ اور مستانہ میں ناسخ کی شہرتِ کاذبہ کا فسانہ تھا:

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا
زیر زمین سے آتا ہے جو گل زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا
طبل و علم نہ پاس ہے اپنے ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا
ہوتا ہے زرد سن کے جو نامرد مدعی
رستم کی داستان ہے اپنا فسانہ کیا
یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتشؔ غزل یہ تو نے لکھی عاشقانہ کیا

انسان تو انسان در و دیوار جھوم رہے تھے:

درختوں سے لگ لگ کے بادِ صبا
لگی وجد میں بولنے واہ وا

ایک تواجد بہم پہنچا تھا جیسے کہ جہاں گزراں جھوم رہا ہو۔ داد و تحسین سے حاضرین کے منھ سوکھے جا رہے تھے۔ حکم شاہی سے دہرا خلعت عطا ہوا مگر قناعت پسند آتش نے عرض کیا،

"میری عزت وہی ہے کہ حضور نے خاص گڑگڑی مرحمت فرمائی۔ یہ خلعت شیخ کو مرحمت ہو۔ فقیر کو اپنا صلہ مل گیا۔"

مگر یہ ساری بیت بحثی، نوک جھونک، حریفانہ کشاکش صرف اشعار تک محدود تھی۔ آتش نے ساری زندگی ناسخ کا احترام کیا۔ جب وہ پہلوان سخن ید قضا کے ہاتھوں شل ہو کر رہ گزار عالم بقا ہوا، آتش کو خبر ہوئی تو چیخ مار کر روئے۔ ایک شاگرد نے کہا، "استاد رونے کا کیا مقام ہے۔ وہ تو آپ کے حریف تھے۔ ہمیشہ سے دشمنی چلی آتی تھی۔ یہ تو خوشی کی بات ہے کہ ایک حریف کم ہوا،" بولے، "میاں کیا کہتے ہو۔ ہم اور وہ فیض آباد میں مدتوں ایک رئیس کے نوکر رہے۔ مدتوں ہم پیالہ ہم نوالہ رہے، ہمیشہ دوستی کا برتاؤ رہا۔ شاعرانہ نوک جھونک کی اور بات ہے اور میاں میرے اتنا پرانا دشمن بھی نہیں ملتا۔" یہ لکھنؤ کی تہذیب اور سلاست روی کا اثر تھا کہ شاعرانہ مسابقت نے ہجو کا انداز اختیار نہیں کیا۔ ورنہ اسی لکھنؤ میں انشا اور مصحفی کی معرکہ آرائی ہو چکی تھی۔ بنگلے میں سودا اور ضاحک ایک دوسرے کے منہ آئے تھے۔ کیسا فساد شعر ہوا تھا۔ آتش نے شاعری میں بھی تکلف اور پردہ دری کو ملحوظ رکھا۔ کہا تو صرف یہ کہا:

روسیہ دشمن کو یوں پاپوش سے کیجیے فگار
جیسے سلہٹ کی سپر پر زخم ہو شمشیر کا

طبیعت میں دیانت تھی، غیرت اور قناعت تھی۔ ولی عہد اصلاح لیتے تھے۔ غزل بھیجتے تھے۔ آتش توجہ سے بناتے تھے۔ آخر عمر میں جب نقد بصارت سے محروم ہو گئے تو ولی عہد کی غزل کسی معتبر شاگرد سے پڑھواتے۔ اصلاح لکھواتے اور بھیج دیتے۔ لگائی، بجھائی کرنے والے قیامت ہوتے ہیں۔ شوشہ چھوڑا، استاد غزل خود تو بنا نہیں سکتے۔ کوئی شاگرد دیکھ کر بھیج دیتا ہے۔ ولی عہد کھٹک گئے مگر غزل بھیجتے رہے آتش کو بھی خبر ہو گئی۔ یہ کرنے لگے کہ جو غزل آتی۔ بہت خوب سبحان اللہ لکھ کر واپس کر دیتے۔ تنخواہ آئی تو وہ بھی لوٹا دی کہلوا دیا، "جب اصلاح نہیں دی تو تنخواہ کس بات کی۔ میں حرام کی تنخواہ نہیں لیتا" ولی عہد کو خبر ہوئی۔ بہ نفس نفیس تشریف لائے بڑی معذرت کی۔

آتش دلدادۂ غزل تھے۔ ساری زندگی غزل گوئی میں گزری۔ کسی دوسری صنف سے

انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی نہ قصیدہ لکھا نہ مثنوی۔ دیوان دو ہیں۔ دیوان میں صرف غزلیں ہی غزلیں مگر غزلوں میں وہ نشتر جن کی خلش مرزا غالب جیسے نامور معاصر نے بھی محسوس کی تھی اور مصحفی جیسے استاد نے شاگرد کی تخلیقی صلاحیت کا اندازہ کر کے بڑائی کی پیشین گوئی بھی کر دی تھی:

آئینے سے کلام کو کیوں کر کیا ہے صاف
حیران کار ہم بھی ہیں آتش کے حال کے

آتش نے جس دور میں آنکھ کھولی اور ان کی شاعری کا آغاز ہوا، اس دور میں لکھنؤ مصحفی، انشا اور جرأت کے نغموں سے گونج رہا تھا۔ لکھنوی تہذیب پروان چڑھ رہی تھی۔ زبان و بیان کے نئے انداز موجود میں آرہے تھے۔ مصحفی اور انشا نے طویل غزلوں اور مشکل زمینوں کی آبیاری کی تھی۔ لکھنو کا طرزِ احساس دہلی سے علاحدہ ہو کر استوار ہوا تھا۔ شاہ جہاں آباد کے در و دیوار سوگ میں ڈوبے ہوئے تھے:

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے

لکھنؤ کی فضا میں چراغوں کی چمک اور پھولوں کی مہک تھی نغمۂ مستانہ تھا:

فصل گل ہے لوٹیے کیفیت میخانہ آج
دولت ساقی سے مالامال ہے پیمانہ آج
ہم نشیں کہتے ہیں ذکر عیش نصف عیش ہے
میں کہوں تو سُن جمال یار کا افسانہ آج

نئے طرزِ احساس نے شاعری میں بھی نئے انداز کو فروغ دیا۔ مصحفی اور انشاء سے گزر کر ناسخ کا دور شروع ہوا۔ انھوں نے الفاظ کے تلازموں، لفظی صنعتوں، ماحول کی رنگینی، سراپے کی باریک بینی سے ایک طلسم خانہ تعمیر کیا۔ ایڑی چوٹی سے لے کر ناک نقشے تک سب کو ہجر اور فراق کے بجائے وصال اور تصور کے بجائے پیکر کو شعری بیان میں رکھا۔ زبان کے اصول و قواعد متعین کیے مگر پیکر نگاری میں ظاہر کے اسیر ہوگئے۔ لفظوں کی دھوم دھام بہت صناعی اور کاری گری کا اہتمام بہت، لیکن نہ مستانہ روی نہ سوزِ سخن، آتش کہ مرد قانع مست، بے پروا اور وارفتہ مزاج تھے، لکھنؤ کے جوش عشرت اور رنگین مزاجی کو نغمہ مستانہ کی گونج میں شامل کر کے

اپنے ماحول اور فضا کے بہترین نمائندے بن گئے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ قلہ کوہ پر دھونی رمائے، بھبوت جمائے، ایک بیراگی بیٹھا تان اُڑا رہا ہے مگر تان موسیقی کے جملہ آداب سے مملو ہے، بڑی مدھر ہے:

ملی ہے ہم کو بھی خم خانۂ افلاک میں راحت
سرہانے ہاتھ رکھ کر سوئے ہیں زیرِ سبو برسوں

☆

باغ عالم میں رہیں خواب کی مشتاق آنکھیں
گرمی آتش گلزار نے سونے نہ دیا

☆

تونگروں کو مبارک ہو شمع کافوری
قدم سے یار کے روشن غریب خانہ ہوا

☆

فصل بہار آئی پیؤ صوفیو شراب
بس ہوچکی نماز مصلّا اٹھایئے

مشکل پسندی کا دور تھا۔ بڑی سنگ لاخ زمینیں پسند کی جاتی تھیں۔ ہر قافیہ چاہے کتنا ہی کڈھب کیوں نہ ہو ضرور نظم کیا جاتا تھا۔ شعرا قافیے نظم کرنے میں جانیں لڑا دیتے تھے مگر آتش ایسے باکمال تھے کہ ہر مشکل زمین کو پانی کر لیتے تھے۔ ایسے سلیقے اور طرح داری سے شعر کہتے کہ زمین کے مشکل ہونے کا احساس ہی نہ رہتا۔ سادہ برجستہ، غور کیجیے اور جائزہ لیجیے تو زمین بڑی بے ڈھب:

نقش پا سے پھولتا جاتا ہے گلشن زیرِ پا

☆

قدم رکھتے ہوئے جس راستے میں کارواں کھٹکا

☆

آفت جاں ہے ترا اے سرو گل اندام رقص

☆

زمانہ پھر گیا چلنے لگی ہوا الٹی

طرح ہوئی "سرخاب کا جوڑا، کمخواب کا جوڑا" جوڑے ہر طرح کے ہوتے ہیں۔ جُراب کا جوڑا اب ٹکسال باہر ہے۔ آتش کے عہد میں سکہ رائج الوقت تھا۔ کس سادگی سے نظم کیا ہے:

حنا کا رنگ بھی ہو بار جس نازک طبیعت پر
بھلا پہنے وہ کیوں کر پاؤں میں جراب کا جوڑا

آسمان کھٹکا اور پاسباں کھٹکا کی یہ بے تکلفی بھی قابلِ دید ہے:

نہ تم بیزار ہو ہم سے نہ ہم بیزار ہوں تم سے
محبت کا مزا کیا ہے جب آیا درمیاں کھٹکا

اور دیکھیے زمیں پیروں تلے سے نکلی نہیں ہے:

شاہراہ ہستی موہوم میں وہ چال چل
اپنی آنکھوں کو بچھا دیں دوست دشمن زیرپا

کیسی چٹیلی زمین ہے مگر شعر اس سے زیادہ چٹیلا کہ زبان زد خاص وعام ہو گیا:

مشتاق دردِ عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے
کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

اس خاموشی کی سنگینی بھی قابلِ توجہ ہے:

جلا میں شمع کے مانند عمر بھر خاموش
تمام عمر کٹی قصہ مختصر خاموش

یہ استادانہ انداز تھا۔ "روم میں رہنا ہو تو رومیوں کی طرح رہنا پڑتا ہے۔" مکاری گری اور صناعی کا دور تھا تو یہ دکھا دیا کہ ہم اس رنگ میں بھی بند نہیں ہیں:

خواہاں ترے ہر رنگ میں اے یار ہمیں تھے

ماحول کی جگمگاہٹ، عشرت امروز کی حلاوت، سراپے کی نزاکت مطبوع طبائع خاص و عام تھیں۔ آتش اس میں بھی بڑھ چڑھ کر رہے:

سرمہ منظور نظر ٹھہرا ہے چشم یار کو
نیلگوں گنڈا پنھایا مردم بیمار کو

☆

چھلّے جڑاؤ رکھتے ہیں وہ پور پور میں
دکھلا رہے ہیں ہم کو جواہر نگار ہاتھ

☆

سبز پیراہن میں رنگ سرخ یوں ہے یار کا
جیسے مینائے زمردگوں میں گلگوں بادہ ہو
مہندی ہاتھوں میں ملی تو نے جو اے دریائے حسن
انگلیاں رنگ حنا سے شاخ مرجاں ہو گئیں

مگر یہ وہ آتش نہیں جس کے لیے مولانا روم کا فتویٰ ہے:

آتش عشق است کاندر نے فتاد
جوشش عشق است کاندر نے فتاد

آتش کے جوشش عشق کی روداد اور ہی کچھ ہے۔ وہ لفاظی، صناعی، پیکر پرستی، مشکل زمینوں اور کڈھب قافیوں کے شاعر نہیں۔ فقیرانہ شان اور آزاد وضع کے شاعر ہیں۔ نگہ خوش گزرے کے شاعر ہیں:

کیا بادہ گلگوں سے مسرور کیا دل کو
آباد رکھے داتا ساقی تری محفل کو

ہمتِ مردانہ، حوصلے اور جواں مردی کے نغمہ طراز ہیں:

کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

ناگوارا کو جو کرتا ہے گوارا انساں
زہر پی کر مزئہ شیر و شکر لیتا ہے
سر شمع ساں کٹائیے پر دم نہ ماریے
منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہاریے

☆

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش
گلِ مراد ہے منزل میں خار راہ میں ہے

فارسی شاعری میں خواجہ حافظ اپنی رندی، سرمستی اور جوش کی وجہ سے ایک عجیب کیفیت کے شاعر ہیں۔ سکّہ بند نقادوں کو موقع ہاتھ آیا۔ لکھ دیا اردو میں حافظ کی مستی اور جوش خروش، آتش کے یہاں ملتا ہے مگر قدرے ہلکے انداز میں۔ قلم ہاتھ میں ہو تو لکھنے والا جو چاہے لکھ دے:

TheMovingFingerWrites

حق یہ ہے کہ آتش کی مستی کا انداز بالکل الگ ہے۔ یہ بادئہ شبانہ کی مستی نہیں۔ طبع یگانہ کی مستی ہے۔ اظہارِ ذات کا نغمہ اور طبعِ مطمئن کا آئینہ ہے:

بہار آئی چھکا ساقی شراب روح پرور سے
خزاں کا غم بھلا دے بادہ گلگوں کے ساغر سے
مجھ سے دریا نوش کو ساقی پلاتا ہے شراب
دیکھتا ہوں میں بھی ظرف شیشہ و پیانہ آج

☆

ملی ہے ہم کو بھی خم خانہ افلاک میں راحت
سرہانے ہاتھ رکھ کر سوئے ہیں زیر سبو برسوں

☆

ہر شب شب برات ہے ہر روز روزِ عید
سوتا ہوں ہاتھ گردن مینا میں ڈال کر

آتش کے یہاں ارضی محبت اور ارضی مسرت دونوں کا تصور بڑا شاداب اور رنگین ہے۔

ان کی مشہور غزل:

شب وصل تھی چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا
مبارک شب قدر سے بھی وہ شب تھی
سحر تک مہ و مشتری کا قراں تھا
وہ شب تھی کہ تھی روشنی جس میں دن کی
زمیں پر سے اک نور تا آسماں تھا

ان کے تصورِ جمال اور حسنِ خیال کی بہترین مثال ہے۔ یہ ان کا حقیقی رنگ ہے۔ گہرا اور شاداب، ایسی تصویریں ان کے یہاں بے شمار ہیں:

تمام رات ہوئی کر گیا کنارا چاند
اب اترو بام سے تم جیتے ہارا چاند
شب اس کے افعیٔ گیسو کا جو فسانہ ہوا
ہوا کچھ ایسی بندھی گل چراغ خانہ ہوا
حسن پری اک جلوۂ مستانہ ہے اس کا
ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اس کا
تار تار پیرہن میں بھر گئی ہے بوئے دوست
مثل تصویر نہالی میں ہوں یا پہلوئے دوست

اردو شاعری کے روایتی تصورِ عشق کو آتش نے ذاتی واردات کے حوالے سے بڑا موئثر اور دل کش بنادیا ہے:

اس بلائے جاں سے آتش دیکھیے کیوں کر بنے
دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

اس شکوے میں کتنی محبت، کیسی لاگ، کیسا لگاؤ ہے:

مری طرف سے صبا کہیو میرے یوسف سے
نکل چلی ہے بہت پیرہن سے بو تیری

شکوے کے اس انداز میں بے پایاں محبت محسوس ہوتی ہے:

نکلتی کس طرح ہے جان مضطر دیکھتے جاؤ
ہمارے پاس سے جاؤ تو پھر کر دیکھتے جاؤ

☆

ملیں وہ راہ میں اب کی تو کہتا ہوں جو ہو سو ہو
دکھا دو گھر مجھے اپنا مرا گھر دیکھتے جاؤ
جدھر جاتے ہو ہر گھر میں سے یہ آواز آتی ہے
مسیحا ہو جو بیماروں کو دم بھر دیکھتے جاؤ

ان اشعار میں آتش کے عہد کی شعری روایات کے بجائے ان کی شخصیت بذاتِ خود سخن پرداز نظر آتی ہے۔ آتش یہاں کسی روحانی، اَن جانی دنیا کی بات نہیں کر رہے۔ انسانی اور ذاتی حوالے سے محو گفتگو ہیں۔ یہ حوالہ ان کے یہاں جا بجا ملتا ہے۔ شوخی، رنگینی اور رعنائی کے ساتھ:

آئینے دیکھنے کا گزرتا نہیں خیال
اپنی خبر نہیں انھیں میری خبر کہاں

اور وہ پوری غزل، خواہاں ترے ہر رنگ میں اے یار ہمیں تھے۔ جسے پڑھ کر مومن کی "وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا" اور حسرت کی "چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے" ذہن میں اُبھرتی ہے۔ آتش کے یہاں بہت ہلکا اور سنبھلا ہوا طنز بھی محسوس ہوتا ہے جو ان کی آزادہ روی اور غیرت مندی کا اظہار ہے۔

آتش اپنے دبستان کے سوچنے اور غور کرنے والے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں ایسے ایسے پہلو سامنے آتے ہیں جن سے قاری متاثر بھی ہوتا ہے اور سوچتا بھی ہے مگر یہ غور و فکر شاعرانہ صفائی اور برجستگی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ جب ایسے اشعار سامنے آئیں تو کون متاثر نہیں ہوگا۔ کون غور نہیں کرے گا:

نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

☆

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا
اثر کیا تپش دل نے آخر اس کو بھی
رقیب سے بھی مرا ذکر غائبانہ ہوا

☆

وہ کوہ اس بت بے دیں کا کوہِ تمکیں ہے
ہزار ہم نے پکارا نہ کچھ جواب آیا

آتشؔ ہی نہیں ایک زمانہ کوہ تمکیں کا مارا ہوا ہے۔ اپنی ہی آواز کی گونج سنائی دیتی ہے۔ آتشؔ نے امید و بیم کی اس کیفیت اور آخر آخر مایوسی کو اپنی شگفتہ مزاجی سے اس طرح بیان کر دیا کہ مایوسی بھی گوارا ہو گئی ہے۔

حقیقت اور مجاز نے اردو شاعری میں دشواری اور آسانی دونوں کو فروغ دیا ہے۔ دشواری قاری کے لیے، آسانی فن کار کے لیے۔ آتش کے معاشرے نے حقیقت چھوڑ کر مجاز ہی مجاز کو منتہا ٹھہرایا مگر روحانی پہلو کو اخلاقی تمثیلوں سے اُجاگر کر کے پہلو بچایا۔ تمثیل کا کمال دکھایا، صنّاعی سے سجایا۔ آتش نے اس رنگ کو بھی اختیار کیا مگر اسے اپنا فن نہ ٹھہرایا:

گردشِ دوراں سے مردانِ خدا بے باک ہیں
نوح کی کشتی کو اندیشہ نہیں گرداب سے

☆

زور آوری پہ اپنی نہ سرکش کریں غرور
عاجز نہیں خدا کا غضب قوم عاد سے

ہے سزاوار اہل دولت سے فقیروں کا غرور
ہاتھ کو جو کھینچ لے گا پاؤں کو پھیلائے گا

☆

پست فطرت کو ہمیشہ سربلندی سے ہے لاگ
زلزلہ ڈھاتا ہے دیوار و در و محراب کو

آتش نے مسلسل غزلیں کہیں اور خوب کہیں۔ پوری غزل ایک مخصوص تاثر میں ڈوبی ہوئی، وحدتِ خیال، وحدتِ تاثر، وحدتِ بیان، جوش اور مجاز کی نظموں کی طرح سجی ہوئی۔ پڑھے جائیں اور شاعر کے حسنِ نظر، حسنِ فکر اور حسنِ گفتار کی داد دیتے جائیں۔

آتش کے ذہن میں شعری تخلیق کے عمل کا ایک واضح تصور تھا جسے انھوں نے بڑی خوبی سے بیان بھی کیا ہے۔ تخلیق کار کا ذہن کس طرح کام کرتا ہے، خیال اور فکر میں کیا ربط ہے، لفظیات کی کیا اہمیت ہے، مرصع سازی کسے کہتے ہیں۔ آتش نے ان سب کی تشریح کی ہے۔ بڑے سلیقے سے یہ روداد بیان کی ہے:

کھینچ دیتا ہے شبیہہ شعر کا خاکہ خیال
فکر رنگیں کام اس پر کرتی ہے پرواز کا
بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

یہ ایک بڑے فن کار کی شعریات ہے۔ شعری تخلیق کا منظر نامہ ہے۔ اوّلیت خیال و فکر کو ہے۔ بندش الفاظ اور مرصع سازی اس کے بعد۔ پہلے خیال، تاثر، تجربہ، واردات، پھر فکر کی آمیزش سے اس کی تراش خراش، یافت اور بازیافت۔ اس کے بعد لفظیات کا مرحلہ، جہاں بندشِ الفاظ میں مرصع سازی کے سارے لوازم ملحوظ رکھنا پڑتے ہیں۔ تہ داری اس سے پیدا ہوتی ہے:

اپنے ہر شعر میں ہیں معنی تہ دار آتش
وہ سمجھتے ہیں جو کچھ فہم و ذکا رکھتے ہیں

معنی تہ دار کی بات چلی ہے تو آتش کی تہ داری کا یہ سلسلہ بھی قابلِ غور ہے:

یار جانی کا ذرا بھیس بدل لے اے موت
قبض کرنے کو مری روح جو تو آتی ہے

اس شعر کو پڑھتے ہی فانی کا "مری قضا کو وہ لائے دلہن بنائے ہوئے" یاد آتا ہے۔ مجاز کی نظم "مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں" ہمارے عہد کا شعری کارنامہ ہے مگر آتش نے بہت پہلے کہہ دیا تھا:

برق رفتار ہوں منزل ہے مرے زیر قدم
ابر گھیرے مجھے ہر چند کہ باراں روکے

اور مجاز کی "آج کی رات" خواجہ آتش کی "بعد مدت کے تم آئے ہو ادھر آج کی رات" کی یاد تازہ کرتی ہے۔ اور:

مرغ ترانہ سنج ہوں اس بوستاں کا میں
خون بہار ٹپکے اگر خار توڑیے

"لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں۔" کیسی یک رنگی ہے:

کہنے کی بات یہ ہے کہ آتش نے اپنی اور اپنے عہد کی نفسیات کو اپنی شگفتہ مزاجی سے ایک نیا لہجہ دیا۔ مردانگی اور شیوۂ مردانگی کا لہجہ، محرومی کو اُمید سے بدلنے کا لہجہ:

ہوائے دورِ مئے خوش گوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

ہمارے عہد کے فن کار نے محرومی کو تلخی اور تلخ کلامی میں سمو دیا ہے مگر اس عہد میں بھی یگانہ، مصطفیٰ زیدی اور سلیم احمد کی آواز میں آتش کے لہجے کی گونج بہت واضح ہے۔ نئے شاعروں نے آتش سے اکتسابِ فیض نہ کر کے اپنا نقصان کیا کہ آتش "اس کا کتا ہرن سے بہتر ہے" کہنے کے باوجود اردو غزل کو نیا لہجہ دے گئے، نیا آہنگ دے گئے۔ ایسے تہہ دار شعر کہہ کر غزل کے نئے امکانات کو واضح کر گئے:

بدن سا شہر نہیں دل سا بادشاہ نہیں
حواسِ خمسہ سے بڑھ کر کوئی سپاہ نہیں

☆

کسی کا ہو رہے آتش کو کر رکھے
دو روزہ زیست کو انساں نہ رائگاں کاٹے

آتش غریب ساری زندگی سوزِ حرماں سے سلگتے رہے۔ ارذل العمر کی منزل آئی تو یہ آنچ اور تیز ہو گئی۔ نقد بصارت سے محروم ہو گئے، دل کی آنکھیں روشن ہو گئیں، چشم ظاہر سے دیکھنا چھوڑ دیا، صحت جواب دے گئی۔ ۱۲۶۳ھ میں "کوچہ یار میں چلیے تو غزل خواں چلیے" پڑھتے ہوئے رخصت ہو گئے، مگر آتش مجازی اور شعلہ بیانی کا مرقع چھوڑ گئے:

زمانے میں کوئی تجھ سا نہیں ہے سیفِ زباں
رہے گی معرکے میں آتشؔ آبرو تیری

شیخ امام بخش ناسخ

آناً فاناً میں وزارت پناہ کے پیادوں نے محلہ ٹکسال کے اس مکان عالی شان کو جہاں سکّوں کی بجائے سخن کی اشرفیاں ڈھلتی تھیں، گھیر لیا۔ چیونٹیوں کی طرح چاروں طرف پھیل گئے۔ ارد گرد کے مکانوں کی زنجیریں کھڑکنے لگیں۔ اتنے میں دروازے سے ایک شخص برآمد ہوا۔ ملنگ، کالا بھجنگ، ننگ، دھڑنگ، لحیم شحیم، گھٹا سر، ٹوٹے کان، لنگ چڑھائے، گونجیلی آواز میں بولا، ''شیخ صاحب نہارہے ہیں۔ آپ لوگ ٹھہریں۔'' وہ تو یہ کہہ کر تیز تیز قدموں سے اس طرف بڑھ گیا جدھر سے دت کاندو کے یاتری ڈولا کندھے پر رکھے رواں دواں تھے۔ اس نے دوڑ کر ڈولا اپنے کندھے پر ٹکایا اور بم مہادیو، بم مہادیو بم بم کے نعرے لگاتا آگے بڑھ گیا۔

پیادے انتظار کرنے لگے، ایک گھنٹہ، دو گھنٹے، تین گھنٹے گزر گئے۔ شیخ صاحب ہیں کہ نکلتے ہی نہیں۔ یہ کیسا نہانا ہے۔ کسی نے کہا بھائی میرے غسل جنابت یا غسل میّت ہوتا تو اب تک وہ بھی ختم ہو جاتا۔ یہ کیسا نہانا ہے۔ کوا گھبار بڑھی تو اندر سے ایک ملازم نکلا۔ بولا، کس کی تلاش ہے، کس کی جستجو ہے۔ پیادوں نے کہا، شیخ امام بخش ناسخ کو وزارت پناہ نے طلب کیا ہے۔ حکم ہوا ہے۔ فوراً حاضر کیا جائے۔ ہم انھیں لینے آئے ہیں۔ وہ مرد بولا، شیخ صاحب یہاں کہاں۔ بڑی دیر ہوئی جا چکے ہیں۔ اس وقت ایک پیادے نے کہا، میاں شکار ہاتھ سے نکل گیا۔ وہی تو تھے جو ہمیں نہانے کا جھانسا دے کر بم بم کرتے صاف نکل گئے۔ اب ہم وزارت پناہ کو کیا منہ دکھائیں گے۔ اس دفعہ حکم بہت سخت تھا کہ ہر دفعہ بچ کر نکل جاتے ہیں، اس مرتبہ جیسے بھی ہو پیش کیا جائے مگر اب کے بھی منہ کی کھائی، مراد بر نہ آئی۔

سخن ور شائستہ پاسخ، شیخ امام ناسخ، فصاحت مآب، استاد بے بدل و لاجواب، موجد طرز لکھنؤ، دوست نواز مصلحت خو، نواب معتمد الدولہ، آغا میر ضیغم جنگ اوّل وزیر اعظم سلطنت

اودھ کے متوسلین میں تھے۔ وزارت پناہ کے مقرب، صاحب اعتبار، حامل اختیار، سیاہ و سفید کے مالک تو نہیں تھے لیکن امور سلطنت میں کسی حد تک دخیل ضرور تھے، مگر فتنہ پردازی چرخ واژوں عیاں ہے آگاہ ایک جہاں ہے۔ بادشاہ نے آن کی آن میں معتمد الدولہ کو معزول کیا۔ ان کے حریف حکیم مہدی خاں منتظم الدولہ قرار پائے۔ خلعت وزارت سے سرفراز ہوئے، شیخ صاحب آقا پرستی کی دھن میں ان کی ہجو لکھ چکے تھے۔

روبہ صفت ز ہیبتِ ضیغم گریختہ
کاشو برائے پختن شلغم گریختہ

اور ایک دفعہ معتوب ہونے کے بعد جب وہ دوبارہ لکھنؤ آئے تھے تو شیخ صاحب نے "کاشو برائے خوردن شب دیگ آمدہ" کہہ کر ہجو کے رنگ کو اور گہرا کر دیا تھا۔ حکیم صاحب نے منصب سنبھالتے ہی حکم جاری کیا کہ شیخ امام بخش ناسخ کو ہمارے حضور میں پیش کیا جائے۔ اس طرح کے احکام پہلے بھی جاری ہوئے تھے مگر شیخ صاحب ہاتھ نہیں آئے تھے۔ اس دفعہ بھی پیادے حکم کی تعمیل میں دوڑے مگر شیخ صاحب استادِ سخن ہی نہیں سخن سازی کے بھی بادشاہ تھے۔ اپنی بات رکھی صاف نکل گئے، الہ آباد پہنچ گئے۔ دائرہ شاہ اجمل میں مقیم ہوئے۔

ہر پھر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں اب قدم
آئی کہاں سے گردش پرکار پانوں میں

شام کو بادشاہ کو پرچہ گزرا کہ شیخ امام بخش ناسخ اس ہئیت کذائی سے یاتری کا روپ دھارے بم بم کرتے صاف نکل گئے اور حکیم کے قرنبیق میں کشید ہونے سے بال بال بچ گئے۔ بادشاہ یہ ماجرا سن کر بے اختیار ہنس پڑے۔ حکیم طلب ہوئے۔ ارشاد ہوا، اب اس کا قصور معاف کرو دل اس کی طرف سے صاف کرو۔ حکیم نے دست خاص سے شقہ لکھا۔ بادشاہ کی جانب سے ازراہِ مرحمت خسروانہ سو روپے ماہوار بطور تنخواہ مقرر ہو گئے۔ شیخ صاحب ٹکسال میں مطمئن بیٹھ کر پھر اشعار آبدار ڈھالنے لگے۔

زمانہ بدلتا ہے، حالات بدلتے ہیں، مزاجوں میں تغیر ہوتا ہے، انداز اور روش میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے مگر بنیادی قدریں نہیں بدلتیں۔ طالع آزما آج بھی تنگ و تاز میں وسعت پیدا کرنے

کے لیے دبئی، شارجہ، سعودی عرب اور امریکا کا رخ کرتے رہتے ہیں۔ پُرانے زمانے میں بھی یہی ہوتا تھا۔ لاہور کے ایک طالع آزما شیخ خدا بخش قسمت آزمانے کی دھن میں لاہور سے فیض آباد پہنچ گئے، جہاں دولت کی گنگا بہہ رہی تھی اور بنگلے میں میلے کا سماں تھا۔ یہیں ان کے بیٹے امام بخش پیدا ہوئے، جن کے نام نامی سے باپ کے نام کو بھی عزت و شہرت حاصل ہوئی۔ امام بخش کو بچپن ہی سے تن سازی اور پہلوانی کا شوق تھا۔ ورزش کرتے، ڈنڈ پیلتے، بیٹھکیں لگاتے۔ کچھ ہی دنوں میں شہر کے جسیم لوگوں میں شمار ہو گیا۔ پہلوانوں میں شمار ہونے لگا مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ شیخ امام بخش پہلوانی میں اوقات ضائع کریں۔ ملک سخن کی پہلوانی ان کے نام لکھی جا چکی تھی۔ فیض آباد سے لکھنؤ آئے اور مسند شاعری پر متمکن ہو گئے۔

نواب محمد تقی فیض آباد کے ایک رئیس تھے۔ ابتدا میں ان کے سرپرستی میں رہے۔ لکھنؤ آئے تو نواب کاظم علی نے بیٹا بنا لیا۔ علم کا شوق تھا۔ اسی کی تحصیل میں لگے رہے۔ شاعری کا ذوق ہوا۔ کچھ غزلیں لکھیں۔ اس وقت سارے شہر میں میر صاحب کی عظمت کا ڈنکا بج رہا تھا۔ یہ بھی خدمت بھی حاضر ہوئے مگر کہاں خدائے سخن کہاں ایک نومشق مبتدی۔ میر صاحب نے حسب عادت و مزاج التفات ہی نہ فرمایا۔ شیخ صاحب بے نیل و مرام واپس آ گئے۔ نگاہِ انتخاب میاں مصحفی پر پڑی جن کے تلامذہ کا بڑا گروہ موجود تھا۔ مصحفی نے انھیں اپنے شاگرد محمد عیسیٰ کے سپرد کیا۔ کچھ دن تنہائی میں تنہا سے مشورت جاری رہی پھر ذوق سلیم کو رہ نما بنایا۔ اصلاح لینے کا دوازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا اور اصلاح دینے کا دروازہ کھول دیا۔ آہستہ آہستہ شاگردوں کا بڑا گروہ تربیت حاصل کر کے تیار ہو گیا اور شیخ صاحب استاد مسلم الثبوت قرار پائے۔

شیخ صاحب جسم کے اعتبار سے پہلوان تھے۔ گٹھا ہوا بدن، مضبوط ہاتھ پاؤں، بھاری بھرکم، گھٹا ہوا سر، ٹوٹے ہوئے کان، خشخشی ڈاڑھی، بھاری آواز، چال ڈھال میں صلابت مگر مزاج میں درویشی اور لطافت۔ سادہ لباس، سادہ خو، دولت نواز، شاگرد پرور، وضع دار، محمد عیسیٰ تنہا مرض موت میں مبتلا تھے۔ عسرت اور تنگ دستی کا دور دورہ تھا۔ کہیں سے کوئی یافت نہیں تھی۔ بیوی نے کہا، تم میں اور شیخ ناسخ میں بڑا اتحاد ہے۔ اگر اپنی تنگ دستی کا احوال انھیں لکھ بھیجو تو وہ ضرور مدد کریں گے۔ تنہا نے کہا تمام عمر میرا ہاتھ بالا رہا۔ اب میں ان کا دست نگر ہو جاؤں۔

میری غیرت اس ننگ کو قبول نہیں کر سکتی۔ بات آئی گئی ہوئی مگر اس دُور اندیش خاتون نے خفیہ طور پر شوہر کی اجازت اور علم کے بغیر ان کی حالت شیخ صاحب سے کہلوا بھیجی۔ شیخ نے احوال سنا، فرط اندوہ سے سر کو زانو پر جھکا لیا، کچھ دیر اس عالم میں رہے پھر صندوقچہ طلب کیا۔ دو سو روپے نکالے۔ تنہا کے یہاں بھیجے اور کہلوایا کہ "ایسے خادم دیرینہ سے اکراہ اور ننگ و عار نہیں چاہیے"۔

تنہا کا انتقال ہو گیا تو بڑے اندوہ سے تاریخ وفات لکھی:

کلک ناسخ نے لکھا مصرع تاریخ وفات

آج تنہا گیا دنیا سے عدم کو تنہا

شاگردوں کے ساتھ سلوک کرتے رہتے تھے۔ جسے بے کار دیکھا کسی امیر رئیس سے کہہ سن کر ملازم رکھوا دیا۔ خاموشی سے روپے پیسے سے مدد کر دی۔ حریفوں سے نوک جھونک بہ انداز شاعرانہ رہی، ان کی عزت اور احترام کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھا۔ نواب سیّد محمد خان رند کہ رؤسائے لکھنؤ میں ممتاز تھے شیخ صاحب کے حریف خواجہ حیدر علی آتش کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے تھے۔ خواجہ صاحب سے سلوک بھی کرتے رہتے تھے۔ ایک بار خدا معلوم کیا ہوا کہ خواجہ صاحب کی کوئی اصلاح پسند نہ آئی۔ دل برداشتہ ہو کر سوچا، کوئی اور ٹھکانا ڈھونڈنا چاہیے۔ آتش پرستی شایان رندی نہیں۔ شہر میں استاد دو ہی۔ کچھ دن خاموش رہے۔ پھر ایک روز نے سدھ بدھ کی لی اور نے منگل کی لی۔ شیخ صاحب کی بارگاہ میں جا پہنچے اور حلقہ تلامذہ میں شامل کر لینے کی درخواست کی۔

کوئی اور ہوتا تو خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ لائق، معروف اور معزز شاعر پکے ہوئے پھل کی طرح جھولی میں آ گرے تو خوش کون نہیں ہوتا، مگر وضع داری اور احترام معاصر بھی کوئی چیز ہے۔ شیخ نے دو باتیں کہیں۔ دونوں کانٹے کی کہ نوک نشتر کی طرح دل میں چبھ جائیں۔ کہنے لگے، آج آپ خواجہ صاحب سے ناراض ہو کر میرے پاس آئے ہیں۔ کل مجھ سے ناراض ہوں گے تو کسی اور کے پاس چلے جائیں گے۔ اس ہیرا پھیری سے نہ آپ کو فائدہ ہوگا نہ مجھے۔ دوسرے یہ کہ آپ خواجہ صاحب سے کچھ سلوک بھی کرتے رہتے ہیں، اگر میرے شاگرد ہو گئے تو سلوک کا وہ سلسلہ بند ہو جائے گا۔ اس کا صبر کس پر پڑے گا۔ خواجہ صاحب کو تکلیف ہوئی تو وہ کس سے

کہیں گے۔ نواب سیّد محمد رند کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ شکریہ ادا کر کے لوٹ گئے۔ شیخ صاحب کی سیر چشمی اور احترام معاصرین نے ان کا بھرم بر قرار رکھا۔ پھر ساری زندگی آتش بجاں رہے۔

شیخ صاحب امیروں وزیروں کے مقرب تھے۔ صاحب ثروت تھے۔ ان کا دولت کدہ علم و ادب کی بار گاہ تھا۔ ایوانِ شعر و ادب، شاگرد حاضر ہیں۔ غزلوں پر اصلاح ہو رہی ہے۔ علمی نکتے بیان ہو رہے ہیں۔ فن شعر کی نزاکتیں اور باریکیاں سمجھائی جا رہی ہیں۔ الفاظ پر کھے جا رہے ہیں۔ ردّ و قبول کی بحثیں ہو رہی ہیں۔ اصلاحِ زبان کے دستور وضع کیے جا رہے ہیں۔ آنے والے علمی سوال دریافت کر رہے ہیں۔ شافی جواب سن رہے ہیں۔ مشاعرے میں کسی کا خاکا اُڑا تو شیخ صاحب مدد کو موجود۔ مرزا جعفر کے یہاں ایک مشاعرہ ہوا۔ میاں مصحفی کے ایک شاگرد موجیؔ نے غزل پڑھی:

گیا نہانے جو وہ بے نقاب در تہہ آب
تو رنگ رخ سے کھلا ایک گلاب در تہہ آب

میں رویا یاس کی حالت میں تشنگی سے جب
تو آگئی وہیں موج سراب در تہہ آب

بہے ہیں دیدہ گریاں سے اس طرح آنسو
رواں ہو چشمے سے جس طرح آب در تہہ آب

مشاعرے کی سیاست، مبتدیوں کو رُسوا کرنے کی شرارت، اعتراض کرنے کون اُٹھا۔ فارسی کے مسلم الثبوت استاد مرزا قتیل، بقولِ غالب فرید آباد کا کھتری بچہ۔ کہنے لگے گل کو گلاب کہنا غیر مستعمل اور چشمہ بیرون آب ہے اور سراب محض ریگستان ہے۔ ریگ اور موج سے کیا نسبت۔ اتنا بڑا استاد، ایسے مستحکم اعتراض، بے چارے موجیؔ سر مشاعرہ پانی پانی ہو گئے۔ مشاعرے کے بعد استاد کے پاس دوڑے گئے۔ انھوں نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ میں شاگرد کے لیے آشنائے دیرینہ سے بگاڑ نہیں کر سکتا۔ شاگرد تو بہت مل جائیں گے۔ ایسا یار آشنا کہاں سے ملے گا۔ شیخ صاحب کو علم ہوا کہ استاد بھی شاگرد کے آڑے نہ آئے تو موجی کو بلوایا۔ اعتراضوں کے جواب لکھوائے۔ کہا، اگلے مشاعرے میں بے جھجک پڑھ دو۔ خوف کی کوئی بات نہیں ہے۔

اگلے مشاعرے میں میاں موجی نے اپنی موج میں لہرا کر کہا، افصح الفصحا مرزا قتیل صاحب! آپ نے اس ہیچ مداں کی غزل پر جو اعتراض کیے ہیں، ان کے جواب بھی سُن لیجیے۔ آپ نے فرمایا کہ گل بمعنی گلاب غیر مستعمل ہے، اردو میں نہیں آتا۔ تعجب ہے آپ سا فخر زمانہ ایسی بات کہے۔ سب جانتے ہیں کہ محاورہ اہل ہند میں گلابی جاڑا اس موسم کو کہتے ہیں جس میں گلاب کھلتے ہیں اور گلابی رنگ بھی منسوب بہ گلاب ہے۔ اسے بھی چھوڑیے، سماعت فرمائیے کہ خدائے سخن میر تقی میر کیا فرماتے ہیں:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

اور حضرت میرزا مظہر جان جاناںؒ کا ارشاد ہے:

عالم ہے یہ پسینے کا اس مست خواب پر
پڑتی ہے اوس جیسے سحر کو گلاب پر

اور استاد بندہ شیخ غلام مصحفی فرماتے ہیں:

سرخ ہے مے سے وہ چشم نیم خواب نرگسی
یا یہ باغ حسن ہیں پھولا گلاب نرگسی

اور:

دلّی بھی طرفہ جا ہے کہ ہر اک گلی کے بیچ
بکتے ہیں کوڑی کوڑی کٹورے گلاب کے

اور آپ نے جو فرمایا ہے کہ "چشمہ بیرون آب" ہے۔ فی الحقیقت سعدیؔ نے گلستاں میں غلطی فرمائی ہے:

سرچشمہ شاید گرفتن بہ میل
چو پُر شد نہ شاید گذشتن بہ بیل

اور آپ کا یہ فرمانا کہ سراب محض ریگستان ہے اور اسے موج سے کیا نسبت تو سنیے ناصر علی سرہندی کی زبانی:

نمی دانم کدامی شہ سوار آمد دریں وادی
کہ از صد جا گریباں چاک شد موج سرابش را

سب سمجھتے تھے کہ لالہ موجی رام کی کیا حقیقت کہ جواب دیتے۔ ان میں اتنی لیاقت کہاں، سب کیا دھرا شیخ صاحب کا ہے۔ سارے شہر اور طبقہ شاعراں میں ان کے علم و فضل اور دید و دریافت کی دھاک بیٹھ گئی۔ مرزا قتیل ایسے ماہر فن کے اعتراضوں کو چٹکیوں میں اُڑانا اور اُلٹا انھیں کو سر میدان سخن زیر کر لینا معمولی بات نہیں۔ باریک بینوں اور نکتہ پردازوں کے مرکز میں اعتبار اسی طرح حاصل ہوتا ہے۔ وقار اسی طرح بڑھتا ہے۔ اس عہد کا لکھنؤ بغداد و قرطبہ کا ہم سر تھا۔ ہر فن کے کامل وہاں موجود تھے۔ شیخ امام بخش ناسخؔ نے اپنی محنت، ریاضت اور صلاحیت سے اس ہم سر بغداد و قرطبہ کے ایوانِ سخن میں کلیدی حیثیت حاصل کر لی مگر وضع داری یہ تھی کہ سر مشاعرہ بذات خود دوبدو نہیں کی۔ معترض کو جواب دلوایا تو اسی سے جس پر اعتراض کیا گیا تھا۔

شیخ بڑے تن و توش کے آدمی تھے، جم کر ورزش کرتے تھے۔ مشہور تھا کہ روانہ ہزار ڈنڈ پیلتے ہیں۔ ایک ہزار اس لیے کہ "یاغفور" کے اعداد ہیں مگر اس تن و توش کے باوجود بُردبار اور متحمل مزاج تھے۔ حریف چپکے چپکے ان پر پھبتیاں کستے۔ شہر میں پھیلاتے۔ شور و غل مچاتے مگر شیخ تحمل کا کوہِ گراں تھے۔۔۔ پھبتیاں سنتے، ہنس کر ٹال دیتے۔ کہنے والے نے کہا:

روسیہ دشمن کا یوں پاپوش سے کیجیے فگار
جیسے سلہٹ کی سپر پر زخم ہو شمشیر کا
وارث ہونا دلیل فرزندی ہے
میراث نہ پاسکا کبھی کوئی غلام

اپنے رنگ روپ، سیہ فام، فربہ اندام ہونے کے اعتراض کا شافی جواب بھی دے دیا:

میں گو کہ حسن سے ظاہر میں مثل ماہ نہیں
ہزار شکر کہ باطن مرا سیاہ نہیں

یہ شاعرانہ چوٹیں تھیں۔ اِدھر سے اعتراض ہوتا اُدھر سے جواب، کھاؤں کدھر کی

چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ والا معاملہ نہیں تھا۔ بازی برابر رہتی اور بعض اوقات پالا شیخ صاحب کے ہاتھ رہتا کہ وضع کے پابند، اُٹھنے بیٹھنے، ملنے جلنے، کھانے پینے، داد و دہش سب میں ایک خاص سلیقے کے حامل تھے۔ خوش خور تھے مگر وقت کے پابند۔ لکھنؤ کے باہر ایک رئیس کے مہمان تھے۔ اس نے ان کے لیے خصوصی طعام کا انتظام کیا۔ رکاب داروں نے لگائی دیر، خوان تیار ہوتے رہے۔ شاگرد پیشہ کو کھانا پہلے مل گیا، شیخ نے دیکھا ملازم کھانے کے خوان لیے چلے آتے ہیں۔ بلایا کہا یہ کھانا یہیں رکھ دو۔ انھوں نے کہا حضور یہ تو ملازموں کا کھانا ہے۔ بولے تو کیا ہوا۔ ہمارا کھانا آئے تو تم کھالینا۔ یہ کہا اور ملازموں کا معمولی کھانا، بڑی رغبت سے نوش جاں کر گئے۔ رئیس کو خبر ہوئی تو ماش کی دال کی طرح اینٹھے اور دم پخت ہو کر رہ گئے۔ طبع درویشانہ کے ساتھ کسی قدر نازک مزاج بھی تھے۔ کوئی صاحب ملنے آئے۔ فرش پر خوش نما سیتل پاٹی بچھی تھی۔ انھوں نے شغل کے طور پر ایک تنکا توڑ لیا، ذرا دیر میں توڑ مروڑ کر پھینک دیا۔ پھر دوسرا تنکا توڑ لیا۔ اس سے شغل فرماتے رہے۔ شیخ صاحب نے ملازم کو آواز دی وہ حاضر ہوا تو کہا۔ کل جو نئی جھاڑو آئی ہے اٹھالاؤ۔ وہ غریب ہکا بکا جھاڑو اٹھالایا۔ شیخ نے ان صاحب سے کہا لیجیے حضرت اس جاروب سے شغل فرمایئے ورنہ غریب کی سیتل پاٹی گوری کے جوبن کی طرح چٹکیوں میں اُڑ جائے گی۔ تادیب نہیں تھی، طنز بھی نہیں تھا۔ ادب آموزی کا سلسلہ تھا۔ اس تہذیب کی علامت اور اشارہ تھا جو بڑی تیزی سے فروغ پارہی تھی اور مشرقی تمدن کے آخری نمونے کے طور پر اُبھر رہی تھی۔ ادب آموزی میں یہ احتیاط کہ دوستوں اور شناساؤں کو مشورہ دیتے تو اس کی وجہ بھی بیان کرتے تاکہ ناگوار نہ گزرے۔ میر سعادت علی تسکین ایک شاعر تھے۔ گاہے گاہے آتے رہتے تھے۔ ایک دن آئے تو یہ شعر سنایا:

جس کم سخن سے میں کروں تقریر بول اُٹھے
ہے مجھ میں وہ کمال کہ تصویر بول اُٹھے

شیخ صاحب نے دل بڑھایا۔ کہا، شعر آپ کا خوب ہے لیکن کم سخن کی جگہ بے زبان ہو تو کمال آپ کا ظاہر ہو اور شعر نادر ہو جائے۔ تسکینؔ نے اس مشورے کو بجان و دل قبول کیا کہ اصلاح سے شعر کا نقص دُور ہو گیا اور معنویت ظاہر ہو گئی۔

ناسخؔ نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں، پرورش پائی، شعر و سخن کا آغاز کیا، وہ فیض آباد اور لکھنؤ میں اساتذہ دہلی کا دور تھا۔ خان آرزو، فیض آباد آئے کہ استادالاساتذہ اور فارسی کے شاعر و محقق بے ہمتا تھے۔ مرزا محمد رفیع سودا آئے۔ فیض آباد ان کے اور میر ضاحک کے ہجویہ معرکوں سے گونج اُٹھا۔ مضمون آفرینی اور اپنا تمثیلی انداز ساتھ لائے تھے۔ لکھنؤ کے نوجوان شعرا اس پر مر مٹے۔ دارالحکومت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوا۔ نئی تراش خراش، نئی وضع قطع، زبان کا نیا انداز مگر میر صاحب جب آئے تو انھیں یہ پھبن، یہ بانکپن ایک آنکھ نہ بھایا۔ اپنے ہی حال میں مست رہے اور "خاک دہلی سے کیا ہم کو جدا ایک بارگی، آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار" پڑھتے رہے۔ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا کہ رنگ چمن بھی بدل گیا ہے اور رنگ پیراہن بھی شوخ سے شوخ تر ہوتا جارہا ہے۔ میر سوز آئے، انشا آئے، مصحفی آئے، مرزا قتیل آئے، میر حسن آئے:

کیا قافلہ جاتا ہے کہ تو بھی چلا چاہے

یہ سب اپنے مخصوص طرزِ احساس کے پابند تھے۔ دلی کے دلدادہ اور اس کی تباہی کے ماتم دار تھے۔ نادری، ابدالی، مرہٹی، جاٹ اور روہیلہ ستم گاری کے سیلابِ بلا کو اپنے اپنے گھروں میں دیکھ چکے تھے۔ سلطنت کی بے وقعتی، بادشاہ کی بے بسی، فرنگیوں کی چیرہ دستی سے دلوں میں بے یقینی، روح میں بے چینی، مزاج میں نرمی، طبیعت میں دھیما پن پیدا ہو گیا تھا۔ زندگی کی بے بضاعتی کا فن کارانہ ردّ عمل ان کی شاعری میں اس طرح در آیا تھا کہ ساری شاعری ایک نالہ دل دوز میں ڈوب گئی تھی۔ "فقیرانہ آئے صدا کر چلے" والی کیفیت تھی مگر فیض آباد اور لکھنؤ میں ہوش سنبھالنے والے نوجوان اس طرزِ احساس سے بیگانہ تھے۔ انھیں میر، میر سوز اور مصحفی کی عظمت کا احساس تو تھا لیکن ان کی دنیا شوخ شنگ، روشن، منور اور معطّر دنیا تھی۔

یہ نوجوان زندگی کے جاہ و حشم، حسن کی بے حجابی، محبوب کی بے نقابی، جمال دوست کی ارزانی، قرب و وصال کی فراوانی، زبان کے لوچ، لذت پسندی کی سوچ کے ماحول میں پلے بڑھے تھے۔ وزیر الملک نیرنگی زمانہ سے بادشاہ ہو چکے تھے۔ علاقے میں امن چین، نہ بیرونی حملے کا خطرہ نہ داخلی شورش، محاصل وافر، رعایا شاد، ملک آباد:

خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے

زندگی کے ہر شعبے میں، ہر گوشے میں نیا پن ابھرنے لگا۔ انفرادیت کا اظہار ہونے لگا۔ زبان، لباس، طعام، وضع قطع، رہن سہن، رسم و رواج، طور طریقوں، سب میں نئے انداز، لطافت اور تکلف مابہ الامتیاز، نوجوان شعرانے بھی اپنا رنگ سخن الگ نکالا۔ سودا، انشا، مصحفی، لکھنؤ کے رنگ و آہنگ سے کسی نہ کسی حد تک متاثر ہوئے تھے۔ سنگلاخ زمینوں، مشکل قوافی اور سیر حاصل غزلوں کا رواج پڑ گیا تھا مگر یک رنگی نہیں نیرنگی کا عالم تھا۔ انشا کی بزاتی اور تیز طبعی کی کیفیت جدا تھی اور مصحفی کی مسکینی کا عالم جدا۔ شیخ امام بخش ناسخ نے اپنے عہد کے علمی وفور اور روزمرہ زندگی کے کیف و سرور کو شعر و شاعری سے ہم آہنگ کیا اور اس طرزِ سخن کی بنیاد ڈالی جو طرزِ لکھنؤ کے نام سے مشہور خاص و عام ہوا اور خود ناسخ اس کے موجد کہلائے۔ شعرائے دہلی نے زندگی کے حقائق کو سرمایۂ سخن قرار دیا تھا۔ ناسخ نے اس رنگین فضا اس لطیف و جمال دوست سے روشن ماحول کو بنیاد ٹھہرایا جس میں حسن ظاہر کی چمک دمک نے حقائق کو نظر انداز کر دیا تھا۔ زندگی کی سختی اور صلابت، ماحول اور فضا کی بے یقینی اور سوگواری کا یہاں نہ کوئی موقع تھا نہ اس کے اظہار کا کوئی امکان کہ یہاں زندگی پھولوں کی سیج تھی۔ خوشبو کی لہر تھی۔ رنگ اور نور کا سیلاب تھی۔ ناسخ اسی فضا کے ترجمان اور اسی عہد کی آواز تھے۔ اپنی جنت ارضی یعنی لکھنؤ سے دُور رہنے کے باوجود انھوں نے آلامِ روزگار اور زندگی کی گریزپائی کے اثرات کو نہ محسوس کیا نہ اس طرح بیان کیا کہ سننے والا اس درد کو اپنے دل میں محسوس کرے۔

اس وقت تک شاعری کی زبان اور عام زبان میں کوئی فرق نہیں تھا۔ جو زبانوں پر وہی اشعار میں۔ مرزا محمد رفیع سودا کے استاد والا نژاد شاہ حاتم نے اپنے عہد میں شاعری کی زبان کو اصول قاعدے کا پابند کیا تھا۔ ان کا عہد زبان کی تشکیل کا عہد تھا، شاعری کی زبان کا تعین ضروری تھا۔ شاہ حاتم نے پہلے پہل ایک بڑے استاد کی حیثیت سے یہ فریضہ انجام دیا اور شاعری کی زبان میں ادبیت پیدا کرنے کی کوشش کی جس سے ان کے بعد آنے والے شاعروں نے فائدہ اٹھایا۔

ناسخ کے عہد میں صورتِ حال یہ ہوئی کہ لکھنؤ میں علم و فضل کا چرچا گھر گھر پھیل گیا۔ بڑے بڑے عالم اور استاد یہاں جمع ہو گئے۔ علما، اساتذہ اور شرفا کی زبان علم و فن کی اصطلاحوں

سے معمور ہوگئی۔ زبان میں ایک خاص طرح کی علمیت اور ادبیت پیدا ہوگئی۔ ناسخ نے یہ محسوس کیا کہ شاعری کی زبان میں بھی اسی ادبیت کا اظہار ہونا چاہیے۔ بہت سوچ سمجھ کر انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ شاعری میں جو زبان استعمال کی جائے وہ عام لوگوں کی بول چال کے بجائے ادب کی زبان ہو تاکہ شعر میں شوکت اور عظمت پیدا ہو۔

ہر دور کے کچھ نہ کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ یہ تقاضے دوسرے ادوار کے تقاضوں سے مختلف ہوتے ہیں اور اپنے عہد کی پہچان، شناخت اور حوالہ ہوتے ہیں۔ ناسخ کا عہد اصلاحِ زبان کا متقاضی تھا تاکہ شاعری، فضا اور ماحول کے علمی وفور اور طرزِ احساس سے پوری طرح ہم آہنگ ہو جائے۔ ناسخ نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور اصلاحِ زبان کی کوشش شروع کی جس میں انھیں اس حد تک کامیابی ہوئی کہ لکھنؤ تو لکھنؤ دہلی کے شاعروں نے بھی اسے قبول کیا اور اس پر عمل پیرا ہوئے۔

یہ اصلاح کیا تھی، اس کے بنیادی اصول کیا تھے۔ سب سے پہلے تو ناسخ نے یہ اصول مقرر کیا کہ ولی اور میر کے عہد کے بہت سے الفاظ جو پُرانے ہوگئے تھے، کبھی کبھار بول چال میں استعمال ہو جاتے تھے لیکن بدنما معلوم ہوتے تھے، ان کا استعمال ترک کر دیا۔ دراصل لفظوں کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ نپٹ، کسو اور وا چھڑے جیسے الفاظ عہد ناسخ میں کانوں کو گراں گزرنے لگے تھے۔ لفظ اپنے ماحول اور فضا سے متاثر بھی ہوتا ہے اور ان کی پیداوار بھی ہوتا ہے۔ معاشرہ اور ماحول بدل جاتا ہے تو بہت سے الفاظ، محاورے اور ضرب الامثال اپنی معنویت کھو بیٹھتے ہیں۔ آج کل ملک کے بڑے شہروں میں جو مکان بنتے ہیں ان میں ایک پٹ کے دروازے استعمال ہوتے ہیں۔ دہلیز نہیں بنائی جاتی۔ چناں چہ اب دہلیز، دہلیز کی خاک لے ڈالنا، دہلیز کی مٹی اور دہلیز کے سجدے سب ٹکسال باہر ہوگئے ہیں۔ نئی نسل دہلیز سے واقف نہیں کہ اس نے دہلیز دیکھی ہی نہیں۔ اس تغیر کو ناسخ نے بھی محسوس کر لیا تھا اور مصلح زبان کی حیثیت سے انھوں نے ایسے تمام الفاظ پر خط تنسیخ پھیر دیا جو اپنی معنویت کھو بیٹھے تھے یا استعمال سے خارج ہوگئے تھے۔ اعتراض کرنے والے یہ کہتے ہیں کہ ناسخ نے زبان میں برہمنیت کو فروغ دے کر اس کے اثر کا دائرہ تنگ کیا مگر اس اعتراض کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ ناسخ شعری لفظیات کے مصلح تھے۔ انھوں نے

بول چال کی زبان کے بارے میں کوئی قواعد اور اصول مرتب نہیں کیے کیوں کہ بول چال کی زبان کا معیار اور پیمانہ اس کے بولنے والے سے متعین ہوتا ہے۔ شعری لفظیات کی بات دوسری ہے۔

دوسرا اصول ناسخ نے یہ متعین کیا کہ الفاظ صحت کے ساتھ استعمال ہوں۔ نراج کی کیفیت نہ ہو کہ جیسے جی چاہا شعر میں استعمال کرلیا۔ اشعار سے الفاظ کی صحت کا یقین ہوتا ہے۔ سند لی جاتی ہے۔ کسی لفظ کے تلفظ اور استعمال میں شبہہ ہوتا ہے تو کسی استاد کے کلام میں اس کی سند ڈھونڈتے ہیں اور اسی کے مطابق لفظ کو استعمال کرتے ہیں۔ لغت میں الفاظ کے معنی اور تلفظ کے سلسلے میں سارے حوالے اساتذہ کے کلام سے دیے جاتے ہیں۔ ناسخ کے پیش رو بالعموم اس کا خیال نہیں کرتے تھے۔ لفظ جس طرح بولا جاتا تھا اسی طرح استعمال کرلیتے تھے۔ ہم بھی عام بات چیت میں نرم، گرم اور صدر بے تکلفی سے بولتے ہیں۔ لیکن شعر میں یہ تلفظ اختیار کیا جائے تو سارے پڑھنے اور سننے والوں کو گراں گزرے گا۔ نظیرا کبر آبادی کے کلام کو ان کے عہد کے استادوں میں اسی لیے قابل اعتبار نہیں سمجھا جاتا تھا کہ انھوں نے عوامی تلفظ اور محاورہ بے تکلفی سے اختیار کرلیا تھا۔ ناسخ نے اس بے قاعدگی کے خلاف جہاد کیا۔ شاعری کی زبان کو ادبی روپ دینے کے لیے یہ ضروری بھی تھا۔

پھر ناسخ نے یہ اصول بھی مقرر کیا کہ شعر میں تنافر نہ ہو۔ پُرانے شاعر اس کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ تنافر کیا ہے، ایک ہی آواز پر کوئی لفظ ختم ہوا اور بعد کا لفظ اسی آواز یا اس سے ملتی جلتی آواز سے شروع ہوگیا۔ دو یکساں یا ملتی جلتی آوازوں کے اس طرح جمع ہوجانے سے شعر میں ناگواری کا احساس پیدا ہوجاتا ہے جیسے "پانو پڑتے ہی غرض اس استخواں نے آہ کی۔" اس استخواں کی ادئیگی میں بھی ایک ناگوار کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ "ہم نے دشت امکاں کو ایک نقشِ پا پایا۔" پاپایا میں بھی یہی خرابی ہے۔ شاید اسی خرابی کی وجہ سے مرزا غالب نے اس شعر کو اپنے رائج دیوان میں شامل نہیں کیا تھا۔ کوئی شاعر اس عیب سے محفوظ نہیں رہا مگر ناسخ کی اصول بندی سے شاعروں نے اس سے بچنے کی کوشش ضرور کی اور شاعری کو فائدہ پہنچا۔

تنافر کی طرح ناسخ نے شعر میں تعقید سے بچنے کا اصول بھی مقرر کیا۔ ہم اپنی بات چیت اور تحریر میں جملے اس طرح بولتے اور لکھتے ہیں کہ ان میں قواعد کے اصولوں کا لحاظ کیا جاتا ہے۔

اگر الفاظ قواعد کے اصولوں کے خلاف ہوں تو مطلب یا تو خبط ہو جاتا ہے یا مشکل سے سمجھ میں آتا ہے، مثلاً مرزا غالب کہتے ہیں:

لیتا نہ اگر دل تمھیں دیتا کوئی دم چین
کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ اگر تمھیں دل نہ دیتا تو کوئی دم اور چین لیتا اور جو نہ مرتا تو کوئی دن اور آہ و فغاں کرتا مگر الفاظ قواعد کے مطابق استعمال ہی نہیں ہوئے، لہٰذا تعقید کا عیب پیدا ہو گیا۔ اس عیب سے بھی کوئی شاعر نہیں بچا اور ناسخ کے یہاں بھی یہ عیب ملتا ہے:

ذبح وہ کرتا تو ہے پر چاہیے اے مرغ دل
دم پھڑک جائے تڑپنا دیکھ کر صیاد کا

مگر ناسخ نے اس عیب کو عیب قرار دے کر آنے والے شاعروں کو ایک اصول دے دیا۔ زبان اور شاعری کی صفائی اور پاکیزگی کے لیے ایسے اصولوں کی طرف نئے شاعروں کو متوجہ کرنا شعری قواعد کا اہم تقاضا تھا۔

ان اصولوں کے علاوہ ناسخ نے یہ مشورہ دیا کہ غیر زبانوں کے جو لفظ شعر میں استعمال ہوں ان کے حروف دبنے نہ پائیں کیوں کہ ان سے اشعار میں عیب پیدا ہو جاتا ہے۔ قافیے کے اصولوں کی طرف توجہ دی جائے۔ اس طرح کی بات ہو جیسے سودا کے استاد شاہ حاتم کے اس مطلع میں نظر آتی ہے:

یہ سودا تو دیکھو کہ دل بیچتا ہوں
لے شیشے کو زیر بغل بیچتا ہوں

دل اور بغل کا قافیہ کیسے بندھ گیا۔ اب آپ سوچیں اور سوچتے رہیں۔ اس عہد میں جائز تھا۔ ناسخ نے شاعروں کو توجہ دلائی کہ شعر کہنا ہے تو قافیے کے اصولوں کی پابندی بھی ہونا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ جو جی چاہا کہنے لگے۔

ناسخ کی اصلاحِ زبان و شعر کا ایک اصول یہ بھی تھا کہ شعر میں بھرتی کے الفاظ استعمال نہ ہوں۔ اس قسم کے الفاظ کے لیے اصطلاحی نام "حشو و زواید" ہے۔ کہیں وزن پورا کرنے کے لیے

کہیں کسی اور ضرورت سے شاعر اس قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں مگر ان سے شعر کے حسن اور خوبی میں خلل پیدا ہوتا ہے۔ ناسخ نے اسے ترک کرنے کا مشورہ دیا۔ اس مشورے کا مقصد شعری تخلیق کے حسن میں اضافہ اور زبان کے استعمال میں فن کارانہ سلیقے کا اظہار تھا۔ شاعری کو الفاظ کے تخلیقی استعمال سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ ناسخ کے نامور ہم عصر خواجہ حیدر علی آتش کہہ گئے ہیں:

شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

مرصع سازی اسی وقت ممکن ہے جب شاعر حشو و زواید کے استعمال سے بالکل پرہیز کرے۔ شیخ ناسخ کا یہ مشورہ بڑا با معنی اور اہم ہے۔

اصلاحِ زبان کے یہ اصول ایک عمر کی شعری مشق، فکر اور سخن فہمی کا نتیجہ تھے۔ اردو شاعری کو ان کی ضرورت بھی تھی۔ ضرورت تو آج بھی ہے مگر آج شعر و سخن کا انداز بدل گیا ہے۔ بہت ممکن ہے کچھ عرصے بعد ناسخ کی طرح کا کوئی اور مصلح زبان پیدا ہو جائے اور شعر و سخن کی زبان کے لیے از سرِ نو اصولوں کا تعین کر جائے۔ زبان جتنی وسیع ہوتی جائے گی اصولوں کی ضرورت اتنی ہی بڑھتی جائے گی۔ بہر حال شیخ ناسخ اپنا کام کر گئے اور صحت زبان کے سلسلے میں نام کر گئے۔

ناسخ کی شاعری نے بھی اسی اصلاح زبان کے سایے میں پرورش پائی۔ مشہور ہے کہ انھوں نے کچھ دن تک محمد عیسیٰ تنہا سے مشورہ سخن کیا تھا مگر پھر اپنے کلام پر خود ہی اصلاحی نظر ڈالنے لگے اور کسی استاد کے مشورے کے بغیر مشاعروں میں غزل پڑھنے لگے۔ ادبی تنقید کی زبان میں اس بات کو یوں کہیں گے کہ ان کی تخلیقی انفرادیت استادانہ مشوروں اور اثر و نفوذ سے نہ متاثر ہوئی نہ مجروح، اپنا رنگ ڈھنگ، طرز اور آہنگ خود ہی نکالا اور ایک دنیا کو اس سے متاثر کر لیا۔ لکھنؤ تو کیا ساری اردو دنیا میں ان کی شاعری کا شہرا ہو گیا۔

زمانہ بدلتا ہے، نیا محل بنتا ہے، پُرانا محل گرتا ہے رنگ سخن میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ پیرایۂ بیان، طرزِ کلام اور طرزِ احساس بھی بدل جاتا ہے۔ آج ناسخ کا نام آتا ہے تو شعری منظر نامے پر نظر نہ رکھنے والے قدرے ناگوار لہجہ اختیار کرتے ہیں۔ اچھا وہی ناسخ جن سے اردو غزل میں

ناسخیت کا رواج ہوا۔ وہی لفظی روایتوں، سراپے کی حکایتوں، عشق ظاہر کی وضاحتوں، خیال آرا نزاکتوں، تمثیل کی شباہتوں کے شاعر، وہی ناں جن سے اردو غزل کا سارا زور مجاز میں منتقل ہو گیا اور مجاز بھی کیسا، ہر کیفیت آئینہ مگر کوئی یہ نہیں سوچتا کہ ناسخ اپنے عہد کی آواز، اپنے دور کے ترجمان، اپنی فضا کے مغنی اور اپنے ماحول کے سخن طراز تھے۔ انھوں نے خلا میں رہ کر شعر نہیں کہے۔ اپنے عہد کے عمومی طرزِ احساس کو فن کارانہ انداز سے نمایاں کیا ہے۔ ایک بڑی واضح مثال سامنے آتی ہے۔ اب سے کچھ مدت پہلے ترقی پسند ادب کی دھوم تھی۔ نثر اور شعر دونوں میں ترقی پسندانہ انداز، پیانوں میں خون مزدور کی پرچھائیں نظر آنا، طبقاتی کش مکش، جمالِ محبوب کے بجائے محنت کشوں کے سنہرے بدن کا بیان، سرخ سویرے، رات کے اندھیرے، ظلم، ستم اور استبداد کے گھیرے، منازل جنس کے بے محابا پھیرے، غصہ، غضب، گونج، گرج، شدت پسندی، غزل ہو یا نظم اسی کا بیان تھا۔ لکھنے والے یہی لکھتے تھے۔ پڑھنے والے اسی پر سر دھنتے تھے۔ یہ وقت، عہد، ماحول اور فضا کی آواز تھی۔ آج ہمیں اس میں شدت پسندی اور کسی قدر سطحیت کا احساس ہوتا ہے مگر یہ اپنے دور کی صحیح ترجمان تھی۔ اپنے عہد کی شناخت اور حوالہ تھا۔ یہی آہنگ و انداز دوسرے کہنے والوں اور شعر سے لطف لینے والوں کو مرغوب تھا۔ دلّی کے شعرا میں شاہ نصیر، ذوق، بہادر شاہ ظفر، حافظ احسان اور غالب و مومن کے یہاں ناسخ کی پیروی ملتی ہے۔ غالب کی مشہور غزل ''دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو'' ناسخ کی اثر کی نشان دہی کرتی ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ غالب ہوں یا اقبال، یہ اپنے دور اور عہد سے بہت آگے تھے۔ یہ کسی ایک دور کے فن کار نہیں، ہر دور اور ہر جہت کے شاعر ہیں۔ اس لیے وقت کے ساتھ ساتھ ان کی نئی جہتیں اور آہنگ نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔ ناسخ ایک دور اور ایک عہد کے شاعر تھے۔ ذوق ایک عہد اور ایک دور کے شاعر تھے۔ داغ ایک خاص فضا کے شاعر تھے اس لیے ہم وقت کے بدلتے ہوئے آہنگ میں انھیں نظر انداز کر دیتے ہیں، ان کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ یہ ان کی شخصیت اور ان کے فن کے ساتھ زیادتی ہے۔

عہد ناسخ کے وہ دہلوی شاعر جو لکھنؤ میں رس بس گئے تھے، یہاں کی فضا سے متاثر ہونے کے باوجود کسی نہ کسی انداز میں حقیقت کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ مصحفی تو خیر دل گرفتہ انسان

تھے ہی۔ انشا جیسے ہنسوڑ کے یہاں بھی عشق حقیقی کا پرتو ہے۔ شیخ ناسخ نے سر تا پا مجاز کو اختیار کیا۔ حقیقت کی جستجو اور نغمہ خوانی ترک کر دی۔ بات کیا تھی، بات یہ تھی کہ اکبری دروازے سے لے کر گول دروازے تک کے تمام بالا خانوں کے مہتاب گھروں کے مردان خانے میں بے حجاب نظر آنے لگے تھے۔ امراؤ جان ادا والے مرزار سوا کی شہادت معتبر سمجھی جائے تو بڑے بڑے علمائے کرام اور زاہدانِ عظام بھی ان بام نشیں مہتابوں کی بے محابا جھلک دیکھتے اور اللہ ہو اللہ ہو کے نعرے لگاتے۔ ناسخ نے انھیں مہتابوں کو اپنی شاعری کا مرکز قرار دیا اور چوں کہ انھیں بے محابا دیکھا تھا، بے جھجک دیکھا تھا، بہت قریب سے دیکھا تھا اس لیے ساری تفصیل بھی فن کارانہ انداز سے بیان کر دی۔ ان کی شاعری میں ایڑی چوٹی بھی ہے، ہاتھ پانو بھی ہیں، خالِ رخ بھی ہے، سیب عارض بھی ہیں، مار گیسو بھی ہیں۔ دہن بھی، کمر بھی، چشم بے حجاب بھی، انداز قد بھی، چین پیشانی اور لگاوٹ کا چین بھی، رنگ لب کی جھلک بھی اور درِ دنداں کی آب بھی، ساق صندلیں اور شکم مخملیں بھی، گردن و شکم کے درمیان کی سطح مرتفع بھی۔ ہر حصہ الگ الگ بھی اور بحیثیت مجموعی بھی۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ محبوب کی جنس کا تعین ہو گیا۔ مجاز و حقیقت کی جس کش مکش نے جنس محبوب کو مشتبہ بنا رکھا تھا، اس نغمہ طرازی سے وہ سارا شبہ جاتا رہا اور شاعری ایک پیکر خیالی کے بجائے حقیقی پیکر کی پابند ہو گئی۔ مصنوعی انداز جاتا رہا۔ دو چار اشعار نمونے کے لیے دیکھتے چلیے:

ناخنوں کے بدلے ہیرے جڑ دیے اللہ نے
صاف سونے کے بنائے تیرے سارے ہاتھ پانو

ترشی ہیرے کی کلائی پہنچی میں یاقوت کی
اس پری کو چاہیے کیا اور زیور ہاتھ میں

تیرے دونوں ابروؤں میں سونے کے بُندے نہیں
لٹکی ہے قندیل زریں کعبے کی محراب میں

لب قند، دہن تنگ شکر دانت ہیں مصری
ہے ساق عروس اس بت مغرور کی گردن

چوٹی اس کافر کی ایڑی تک ہے بے شک شام سے
اور گوری گوری کافور سحر کی ایڑیاں
وہ بھبوکا شب تاریک میں جاتا ہے اگر
آئینہ خانے میں کرتے ہیں چراغاں عارض

مگر یہاں اس وضاحت کی بھی ضرورت ہے کہ خوش مذاقی اور بدمذاقی میں برائے نام فاصلہ ہے۔ ذرا بہکے اور پھسلے اور جہاں بیان ایسا ہو کہ نظر بھی پھسلے، پانو بھی پھسلے، وہاں تو اور بھی مشکل ہے۔ چناں چہ بعد کے شاعروں نے پھسلنے کو اپنا فن ہی بنالیا۔ شیخ ناسخ کے یہاں بھی پھسلن ہے:

رانیں نہ پری کی ہیں نہ ہیں حور کی ساقیں
یہ نور کی رانیں ہیں یہ ہیں نور کی ساقیں
بچ رہا ہے تیل جو بالوں سے دے ڈالو ہمیں
اے صنم بہر چراغ زیست روغن چاہیے
کبود رنگ ہے مسی کا تیرے ہونٹ ہیں لال
ملیں جو دونوں تو پیدا نہ کیوں اُدا ہٹ ہو
نقرئی پٹھے کا تو نے نہیں ڈالا موباف
ہے سیہ سارا بدن اور دُم مار سفید

مگر ان کے عہد میں ریاکاری نہیں تھی۔ پڑھنے اور سننے والے ان اشعار سے لطف لیتے تھے کیوں کہ ان میں جو کچھ بیان ہوتا تھا صحت مندانہ نقطۂ نظر سے بیان ہوتا تھا۔ ذہنی بیماری اور روحانی خلش کا کوئی اثر نہیں تھا۔ یہ مشاہدے اور تجربے کا خلاقانہ بیان تھا۔ ہم مشاہدے اور تجربے کے ایسے واشگاف خلاقانہ بیان کو بھی نام نہاد اخلاقی ذہنیت کے خلاف سمجھتے ہیں اگرچہ لذت اندوزی کے مواقع آج کے دور میں بہت عام اور نگاہ و تن کے لیے بہت ارزاں ہو گئے ہیں۔

شیخ ناسخ نے جمالِ محبوب کے تفصیلی جائزے، تجزیے اور تحسین کے ساتھ ساتھ رعایت لفظی کو بھی اپنا شعری ہنر ٹھہرایا۔ رعایت لفظی بے ساختہ ہو، ہنرمندی سے ہو تو شعر کا حسن، اور

ذرا سی بے احتیاطی سے شعر کا سارا حسن غارت، شیخ ناسخ کی رعایت لفظی میں بھی یہی کیفیت ہے۔ بیشتر حسن و خوبی اور کم تر الفاظ کا صَرف محض، دونوں رنگ دیکھیے:

ترے جلانے کو اے سنگ دل صنم ہم نے
اک اور صاعقہ طور سے تپاک کیا

تیرے آنے کی خبر دیتا ہے جب پیک صبا
کیا ہی اے گل پھول جاتے ہیں ہمارے ہاتھ پانو

خوب موزوں ہم سے وصف قد بالا ہوگیا
عالم بالا تک اپنا بول بالا ہوگیا

ہاتھ میں جو ہاتھ اس کا لے لیا اس جرم پر
ہتھکڑی پہنی ہے میں نے ایک مدت ہاتھ میں

چاند تارے کا جو کرتا تو نے پہنا اے صنم
ایک ماہِ نو نظر آتا ہے ہر اختر کے پاس

دم بدم کہتی ہے میری کشتی عمر رواں
مجھ کو آب خنجر قاتل کا طوفاں چاہیے

اس رعایت لفظی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ناسخ شاعری کو ذہنی عمل سمجھتے تھے۔ ان کے یہاں جذباتی ردّ عمل سے گریز ہے۔ صرف جذبے کے مواد سے شاعری کی تعمیر ان کے نزدیک ممکن نہیں تھی۔ اس ذہنی عمل کے حوالے سے انھوں نے تمثیلی انداز کو شاعری کا فن قرار دیا اور اسے بڑی ترقی دی۔ تمثیلی انداز کی جھلک سودا کے یہاں بھی ملتی ہے۔ ناسخ نے اسے بڑی وسعت دی اور سودا کی استادی کا اعتراف بھی کیا۔

پہلے اپنے عہد سے افسوس سوداؔ اُٹھ گیا
کس سے ناسخ جا کے لیں اب اس غزل کی داد ہم

تمثیلی انداز کی کامیابی سے نباہنے کے لیے شاداب، زندہ اور فعال تخیل بہت ضروری ہے۔ کسی دعوے کی شعری دلیل پیش کرنے میں ساری کارفرمائی یا تخیل کی ہوتی ہے یا مشاہدے

کی۔ ناسخ نے دونوں سے کام لیا اور تمثیلی انداز کو بڑی کامیابی کے ساتھ برتا ہے:

جو خوں ریزی کی عادت رکھتے ہیں بے فیض ہوتے ہیں
کہاں ملتی ہے سائل کو کبھی کوڑی کٹاری سے
دشمن سے بھی نہیں ہے حسینوں کو کچھ ضرر
رہتے ہیں آب و باد میں روشن چراغ گل
ازل سے دشمنی طاؤس و مار آپس میں رکھتے ہیں
دل پُر داغ کو کیوں کر ہے عشق اس زلف پیچاں کا
سنگ دل سے صاف دل پیدا جو ہو کب ہے مجال
اہلِ صنعت سنگ سے کرتے ہیں تیار آئینہ
نہ ہوگی گرم صحبت سرکشوں کی خاکساری سے
سلامت رہ نہیں سکتی ہے دم بھر آگ پانی میں

تمثیلی انداز کی حدیں حسن تعلیل سے ملتی ہیں۔ کسی بات کا شاعرانہ سبب بیان کرنا جو اصل سبب سے مختلف ہو۔ ناسخ کے زندہ اور شاداب تخیل نے اس صنعت کو بڑی خوبی سے اپنی شاعری کا جزو بنالیا ہے۔

کر گیا ہے مرے آغوش کو جاناں خالی
اس مہینے کو بجا کہتے ہیں انساں خالی
ہوگئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں
اس لیے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا
مرتبہ کم حرصِ رفعت سے ہمارا ہوگیا
آفتاب اتنا ہوا اونچا کہ تارا ہوگیا
سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

اردو کی قدیم شاعری کے حوالے سے بعض اصطلاحیں بڑی بے تکلفی سے استعمال ہوتی

ہیں۔ مضمون آفرینی، خیال بندی، نازک خیالی، نیا مضمون پیدا کرنا، خیال کا طلسم باندھنا، خیال کی نزاکت، یہ ساری اصطلاحیں ناسخ کے یہاں معراج فن کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مضمون آفرینی:

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا
چاند چھپتا ہے جو دو دن ہوتی ہے مشتاق خلق
ہوگئی قدر اس کی جو نظروں سے پنہاں ہوگیا

خیال بندی:

میں ہوں عالم کے دیوانوں میں موزوں طبع دیوانہ
کرو مجھ کو نشانہ کوہ کے سنگ ترازو کا
دشت غربت جل رہا ہے میری برق آہ سے
لگ اُٹھی تھی جس طرح سے وادی ایمن میں آگ

نازک خیال بندی:

ہوں میں وہ وحشی کہ مثل حلقہ زنجیر پا
شوق ہے چشم غزالاں کو مری پا بوس کا
جب سے اس بت کا سنہرا رنگ ہے پیش نظر
حلقہ اپنی چشم تر کا خاتم زر ہوگیا

لکھنؤ کے ماحول اور فضا میں تصوف کا گزر نہ تھا۔ فارسی کے شاعر شیخ علی حزیں نے طنزاً تصوف کو برائے شعر گفتن کہہ کر اس کی حیثیت اور مرتبے کو شعری دلچسپی تک محدود کرنے کی کوشش کی تھی لیکن تصوف کے زور و اثر نے فارسی اور اردو شاعری کا رُتبہ بلند کیا ہے۔ لکھنؤ میں تصوف کا چرچا نہ ہونے کی وجہ سے ناسخ کے یہاں زندگی کے روحانی پہلو کی عکاسی نہیں مگر اس کمی کو انھوں نے اخلاقی مضامین سے پورا کیا اور پھر یہی شعرائے لکھنو کا شیوہ ہنر بن گیا۔

ہیں جو صاحب درد ان سے دُور ہے سامانِ عیش
بادہ کھینچا ہے کسی نے زخم کے انگور کا

تعمیر پر جو مرتے ہیں نافہم یہ مگر
لے جائیں گے اُٹھا کے در و بام دوش پر
پاک ہیں آلودگی سے جو ہیں وارستہ مزاج
تر نہیں ہوتا کبھی مرمر کا دامن آب میں
اس خرابے میں نہیں ہے کوئی دو دن آباد
آج معمور جو ہیں ہوں گے وہ گھر کل خالی

ناسخ کے شاداب تخیل نے بے شار رُعب دار اور حیرت انگیز تصویریں پیش کی ہیں۔ ان میں شان و شکوہ ہے تیز اور شوخ رنگ ہے۔ کہیں کہیں رنگ بہت گہرے بھی ہوگئے ہیں۔ یہ تصویریں جذباتی سر گشتگی کے بجائے زیر کی اور دانش مندی کی نشان دہی کرتی ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے، ناسخ نے شاعروں کو ایک نیا رستہ دکھایا اور بعد میں آنے والے شاعروں کے لیے اپنے شاداب تخیل، لفظی رعایتوں، خیالی تشبیہوں، حسنِ بے حجاب کی کھلی ڈلی تصویروں صنعت گری اور اخلاقی مضامین کی وجہ سے ایک مثال اور نمونہ فراہم کر گئے۔ ان کے بہت سے شعر ہیں کہ زبانوں پر جاری ہیں۔ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی
تیری صورت سے کسی کی نہیں صورت ملتی
ہم جہاں ہیں تری تصویر لیے پھرتے ہیں
تمام عمر یوں ہی ہوگئی تمام اپنی
شب فراق کٹی روز انتظار آیا
اس ستم گر کو یہاں تک تو مرے ساتھ ہے ضد
میں نے گھر ڈھونڈ نکالا تو وہ گھر چھوڑ دیا
اے اجل ایک دن آخر کو تجھے آنا ہے
آج آتی شب فرقت میں تو احساں ہوتا

ذبح کرڈالوں گا اب کے جو تو بولا شب وصل
میں نے سو بار تجھے مرغ سحر چھوڑ دیا
زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

شیخ ناسخ کے کمالِ فن سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے ان کی ایک نمائندہ غزل بھی دیکھ لیں تو بہتر ہے تا کہ ان کی شعری شخصیت کے سارے پہلو بھی سامنے آجائیں اور اثر کا اندازہ بھی ہو جائے:

صاعقے کے طور سے پڑتی ہے مجھ پر چاندنی
دھوپ بہتر پر شب فرقت کی بدتر چاندنی
رہتی ہے فرقت کی شب باہر ہی باہر چاندنی
میرے گھر کی راہ کترا کر نکل جاتا ہے چاند
میرے ویرانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی
بھول کر او چاند کے ٹکڑے ادھر آجا کبھی
یہ وہ شب ہے جس نے کر لی ہے مسخر چاندنی
نقرئی موباف اس کافر کی چوٹی میں نہیں
دشت، دریا، سبزہ، ساقی، شیشہ، ساغر، چاندنی
ایک ہفتے سے بہم ساتوں میسر ہیں مجھے
آسماں پر ماہِ تاباں ہے زمین پر چاندنی
خاکساری بھی نہ چھوڑے، دے خدا جس کو عروج
گھر کے اندر ہے اندھیرا اور باہر چاندنی
دل سیہ ہے بال اپنے سب ہیں پیری میں سفید
چھپ گئی کیا دور سے صورت دکھا کر چاندنی
کرمک شب تاب تھی گویا شب مہتاب وصل
ہاں اگر زخمی ہوں تو نکلے مقرر چاندنی
غیر تاریکی شب فرقت میں اے ناسخ نہیں

غزل میں طویل گوئی اور قافیہ پیمائی مصحفیؔ اور انشاؔ کے عہد میں شروع ہو گئی تھی۔ ناسخؔ نے اسے فن بنا دیا اور لکھنؤ کی فضا میں ہر ممکنہ قافیے سے معمور دو غزلے سہ غزلے گونجنے لگے۔ شعر کی دنیا میں انقلاب آ گیا۔

ہر فن کی طرح شاعری میں بھی حسد، چشمک، مسابقت اور مقابلے کی فضا ملتی ہے۔ ہم عصروں سے حریفانہ کشاکش ہوتی رہتی ہے۔ ناسخؔ نے روایت عہد کہن کو منسوخ کیا۔ ان کا مقابلہ خواجہ حیدر علی آتش کی آتش فشانی سے ہوا۔ یہ رئیس، وہ درویش، یہ بردبار، وہ مزاج کے جھلّے، کسی زمانے میں ایک ہی رئیس کی بارگاہ سے وابستہ تھے مگر شاعری میں دونوں کی نغمگی کا انداز مختلف تھا۔ کبھی کبھی چوٹیں بھی ہو جاتیں مگر وہ سودا اور ضاحک یا انشا و مصحفی کی سی شورہ پشتی اور زد و کوب والی کیفیت نہیں تھی۔ اِدھر سے سوال ہوا اُدھر سے جواب۔ مشاعرے میں آتش نے

غزل پڑھی، مطلوب کے قافیے پر توجہ چاہی:

لگا کر غوطہ بوسہ لوں گا اس طفل شناور کا
خدا سے گوہر مقصود ہے مطلوب دریا میں

اگلے مشاعرے میں ناسخ نے جو غزل پڑھی اس کے قطعے پر ہوا خواہانِ ناسخ نے بڑا غل مچایا:

اکیلے تم نہانے کو نہ اُترو سن لو ناسخ کی
نہ غوطہ مارے بیٹھا ہو کوئی مردود پانی میں

جو مطلوب تھا وہ مردود ہو گیا۔ سیوا رام شائق آتش کا ایک شاگرد تھا۔ نجانے کیا دل میں آئی۔ شیطان نے انگلی دکھائی یا استاد سے شہ پائی کہ ناسخ کی ہر غزل پر جوابی غزل کہنے لگا۔ شاگردوں نے ناسخ کو اطلاع دی کہ ایک نومشقا آپ کے منھ آنے لگا ہے۔ اوقات بھول کر اِترانے لگا ہے۔ ناسخ نے غزل لکھ دی:

کہہ رہا ہے ایک جاہل میرے دیواں کا جواب
بو مسیلم نے کہا تھا جیسے قرآں کا جواب
کیا کلیم اللہ سے نسبت ہے اس ناپاک کو
چاہیے فرعون کو دے اپنے ہاماں کا جواب

ہامان کا اطلاق خواجہ صاحب کی طرف ہوتا تھا لہٰذا انھوں نے ایک شاگرد کی زبانی جواب دے دیا:

چاہیے مومن کو دے اس نامسلماں کا جواب
جو کہے دیواں کو اپنے ہے یہ قرآں کا جواب

یہ استادانہ اور حریفانہ کش مکش تھی۔ ایک دوسرے کے بخیے ادھیڑنا مقصود نہیں تھا، ایک مشاعرے میں ناسخ اس وقت پہنچے جب محفل سخن تمام ہو چکی تھی مگر خواجہ آتش موجود تھے، سب نے ناسخ سے کہا آپ کا بڑا انتظار رہا ہے۔ ناسخ نے مطلع پڑھا:

جو خاص ہیں وہ شریک گروہ عام نہیں
شمار دانہ تسبیح میں امام نہیں

مطلع بھی بے ساختہ نام بھی امام، حاضرین نے بہت سراہا۔ آتش کا مطلع یہ تھا:

یہ بزم وہ ہے کہ لا خیر کا مقام نہیں
ہمارے گنجفے میں بازی غلام نہیں

غلام کا اشارہ شیخ صاحب کی جانب بھی ہو سکتا ہے۔ ان کی جانب سے اس کا جواب یوں دیا گیا:

جو خاص بندے ہیں وہ بندہ عوام نہیں
ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں

اس مطلع کو بھی بڑی شہرت ہوئی مگر یہ ساری کش مکش دائرۂ تہذیب میں تھی۔ لطف سخن کی فراوانی کے لیے تھی۔ آتش کی مشہور زمانہ غزل "سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا" جسے محمد حسین آزاد نے ایک حریفانہ حکایت کے انداز سے پیش کیا ہے، ناسخ و آتش کی حریفانہ کش مکش کے بجائے آتش کی نازک مزاجی اور ابنائے زمانہ کی ناقدری کی روداد ہے۔ مگر آزاد نے اسے مقابلے اور مجادلے کا انداز دے دیا ہے کہ وہ ہر شعری عہد کے دو بڑے شاعروں کو حریفانہ انداز میں پیش کرنے کے قائل تھے۔

مرزا غالب نے اپنے ایک دوست مرزا حاتم علی بیگ مہر کو جو شیخ صاحب کے شاگرد تھے، ایک دفعہ لکھا کہ تمھارے استاد ناسخ یک فنّے شاعر تھے یعنی صرف غزل کہتے تھے۔ غالب کا مطلب یہ کہ شاعر وہ جو ہر فنّہ ہو یعنی غزل قصیدہ، مثنوی، سب لکھتا ہو مگر ناسخ یک فنّے نہیں تھے۔ انھوں نے قصیدے بھی لکھے، مثنوی بھی لکھی، رُباعیاں بھی لکھیں اور تاریخ کے تو بادشاہ تھے۔ مگر لکھنؤ کے شعرا کا رجحان قصیدہ گوئی کی طرف نہیں تھا۔ وہ شعرائے دہلی کی طرح درباروں سے وابستہ نہیں ہوئے بلکہ خود ہی اپنے دربار سجائے بیٹھے رہے۔ شیخ نے تین دیوان مرتب کیے جو شائع ہو کر مقبول ہوئے اور دو حصوں میں طبع ہوئے۔ قصیدہ اور مثنوی ان میں شامل نہیں ہیں۔ شیخ نے غزل ہی کو اپنا سرمایۂ سخن قرار دیا ہے۔

درخت اپنے پھل سے، باپ اپنے بیٹے سے، پیر اپنے مرید سے اور استاد اپنے شاگرد سے پہچانا جاتا ہے۔ ناسخ کو کثرت سے شاگرد میسر آئے۔ انھوں نے محنت اور محبت سے ان کی تربیت

کی اور انھیں مرتبہ استادی پر فائز کیا۔ اس عہد کا لکھنؤ دو گروہوں پر مشتمل تھا، تلامذہ ناسخ اور شاگردانِ آتش۔ ناسخ کے شاگردوں میں وزیر، برق، رشک، بحر، مہر، منیر شکوہ آبادی۔ سب بجائے خود استاد اور استاد کا نام روشن کرنے والے تھے، وزیر کی ایک غزل اردو شاعری کے ایوان میں آج بھی گونجتی ہے۔ شاید ہمیشہ گونجتی رہے گی۔

چلا ہے او دل راحت طلب کیا شاداں ہوکر
زمین کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہوکر
اسی باعث تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہیں یوسف بے کارواں ہوکر
کیا قتل اس نے غیروں کو موئے ہم رشک کے مارے
اجل بھی دوستو آئی نصیب دشمناں ہوکر
وزیر ایسے کا ہوں شاگرد کہتے ہیں جسے منصف
لیا ملک معانی بادشاہ شاعراں ہوکر

برق، واجد علی شاہ کے مصاحب خاص اور جاں نثار تھے انھیں کے ساتھ کلکتے گئے۔ وہیں انتقال ہوا مرنے سے چند گھنٹے پہلے جلاوطن بادشاہ کی خدمت میں اپنی وفاداری کا یہ پیغام بھیج گئے:

برق جو کہتے تھے آخر وہی کر کے اُٹھے
جان دی آپ کے دروازے پہ مر کے اُٹھے

رشک ماہر زبان تھے۔ منیر نے عالم سرگشتگی میں غزل لکھی:

میرے ہنر کا کوئی نہیں قدرداں منیر
شرمندہ ہوں میں اپنے کمالوں کے سامنے

نواب یوسف علی خان ناظم والی رام پور نے مقطع پڑھ کر بڑی محبت اور سرپرستانہ انداز میں کہا:

ناظمؔ منیرؔ آئے یہاں ہم ہیں قدرداں
شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے

پھر ان شاگردوں کے شاگردوں نے ناسخ کا نام روشن کیا، جلال، قلق، امانت اور نجانے کتنے فیض یافتہ ہیں جو اسی خانوادہ شعر و سخن سے تعلق رکھتے ہیں، بڑا فعال سلسلہ تھا، بڑا زبردست سلسلہ تھا۔

شیخ امام بخش ناسخ محض ایک شاعر، ایک استادِ فن اور مصلح زبان نہیں تھے۔ شعر و سخن کا ایک دبستان تھے۔ لکھنؤ کے شعری آہنگ میں متعدد دبستان ملتے ہیں۔ دبستانِ آتش، دبستانِ انیس، دبستانِ دبیر۔ ہر دبستان اپنی جگہ اور اپنے فن کے اعتبار سے بے مثال اور لاجواب ہے۔ اردو شاعری کے دیوان میں سراپا انتخاب ہے مگر شاعروں کی کثرت، استادانہ عظمت، زبان و بیان کی نزاکت غزل کی آبیاری، تصورِ عشق کی استواری، تن محبوب کی سرشاری، پیراہن دوست کی تیاری اور نزاکت خیال کی باد بہاری نے دبستانِ ناسخ کو بڑی اہم حیثیت عطا کی ہے۔ بار بار جلاوطن ہونے اور امیرانہ ٹھاٹ میں سادگی سے زندگی گزارنے والے اس بزرگ فن کار نے ۱۸۳۸ء میں سفر آخرت اختیار کیا۔ جیتے جی بھی اسکندر ملک سخن رہا۔ آج بھی اسکندر ملک سخن ہے۔ اس کا یہ اعزاز سدا برقرار رہے گا:

آج اے ناسخ میں ہوں اسکندرِ ملکِ سخن
ہیں صفائے لفظ و معنی سے سب اشعار آئینہ

محمد ابراہیم ذوق

مغرب کا وقت تھا۔ دلّی کے ایک بوڑھے شاعر میر کلّو حقیر جامع مسجد کے ایک گوشے میں بیٹھے اوراد و وظائف میں مشغول تھے۔ امام الدین، حقیر شاہ جہاں آباد کے استادانِ فن میں ممتاز تھے۔ بزرگوں میں شمار ہوتا تھا۔ تسبیح پڑھتے ہوئے میر صاحب کی نظر میاں ابراہیم پر پڑی۔ میاں ابراہیم دلّی کے ابھرتے ہوئے شاعر تھے۔ نوجوان تھے۔ سولہ سترہ برس کا سن، پکا رنگ، متوسط قامت، چہرے پر چیچک کے داغ، بڑی بڑی روشن آنکھیں، فراخ پیشانی، کھڑا کھڑا ناک نقشہ، معمولی کپڑے، چال میں تیزی اور پھرتی۔ شعر خوب کہتے تھے۔ شاہ نصیر کے شاگردوں میں تھے مگر اس وقت نجانے کیا بات تھی کہ میاں ابراہیم کے انداز میں معمول کی چونچالی نہیں تھی۔ چہرہ تمتمایا ہوا، کچھ بجھے بجھے سے۔ آنکھوں میں ملگجاپن۔ میر صاحب پرانے چاول تھے، سمجھ گئے کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور۔ محبت سے اشارہ کیا۔ میاں ابراہیم آگے بڑھے۔ میر صاحب کے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔ جھک کر سلام کیا۔ انھوں نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا۔ دل گرفتگی کا انداز کچھ اور نمایاں ہو گیا۔ میر کلّو نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میاں ابراہیم بڑے ادب سے بیٹھ گئے۔ میر صاحب نے سبحہ گردانی موقوف کی، سرپرستانہ انداز میں پوچھا، ”میاں ابراہیم! خیر تو ہے، کچھ پریشان پریشان نظر آرہے ہو۔“ میاں ابراہیم اس ہمدردی اور دلداری سے پگھل گئے۔ بولے، ”میر صاحب قبلہ کیا عرض کروں۔ کہتے ہوئے حجاب آتا ہے“ میر صاحب نے کہا ”اے میاں! کاہے کا حجاب، کہو تو سہی، آخر معلوم تو ہو، ہوا کیا ہے؟“ میاں ابراہیم کہنے لگے، ”قبلہ! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ بندہ استاد شاہ نصیر کے تلامذہ میں شامل ہے۔ استاد توجہ بھی فرماتے ہیں۔ مگر میں نے ایک غزل مرزا سودا کی زمین میں لکھ کر بغرضِ اصلاح پیش کی۔ استاد نے غزل پر نظر ڈالتے ہی مجھے بہت سخت سست کہا۔ غزل پھینک دی اور فرمایا ”اب تو مرزا رفیع

سے بھی اونچا اڑنے لگا ہے۔ آپے سے باہر نہ ہو۔ مبتدی ہو کر یہ ہمت!،، میں نے غزل اٹھالی۔ چپ چاپ چلا آیا۔ میر صاحب استاد الاستاد ہیں۔ بزرگ ہیں مگر اس وقت انھوں نے مجھے بڑا ذلیل کیا۔ تلامذہ کا پورا حلقہ موجود تھا۔ بڑی کرکری ہوئی، جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ سوچا تھا کل جو مشاعرہ ہے اس میں طرحی غزل کے ساتھ یہ غزل بھی پڑھوں گا مگر استاد نے دل ہی توڑ دیا۔ دل میں آتا ہے کہ شعر و سخن ہی سے تائب ہو جاؤں۔" میر صاحب نے نگاہ بھر کر میاں ابراہیم کو دیکھا۔ نوجوانی کے باوجود ان کے کلام میں استادانہ پختہ کاری جھلکتی تھی۔ روزمرہ، محاورہ اور ضرب الامثال خوب باندھتے تھے۔ ہونہار تھے۔ استادانِ فن کا خیال تھا کہ آگے چل کر یہ نوجوان اپنے تمام ہم عصروں سے بازی لے جائے گا۔ شاہ نصیر کی سرزنش سن کر انھیں بڑا رنج ہوا۔ بولے، میاں ابراہیم! ذرا وہ غزل ہمیں تو دکھاؤ۔ میاں ابراہیم نے کاغذ میر صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ میر صاحب پڑھنے لگے:

رکھتا بہر قدم ہے وہ یہ ہوش نقشِ پا
ہو خاکِ عاشقاں نہ ہم آغوش نقشِ پا
افتادگاں کو بے سر و ساماں نہ جانیو
دامانِ خاک ہوتا ہے روپوش نقشِ پا
پابوس درکنار کہ اپنی تو خاک بھی
پہنچی نہ ذوقؔ اس کے آغوشِ نقشِ پا

میر کلّو غزل پڑھتے جاتے اور جھومتے جاتے، مقطع پڑھ لیا تو کہنے لگے، میاں ابراہیم اس عمر میں یہ پختہ کاری۔ یہ اس کی دین ہے۔ تم کسی کے کہنے کا خیال نہ کرو۔ جاؤ۔ کل کے مشاعرے میں یہ غزل بھی پڑھو۔ کوئی کچھ کہے گا تو ہم جواب دیں لیں گے تم نچنت ہو کر غزل پڑھو۔"

میاں ابراہیم نے دوسرے دن مشاعرے میں طرحی غزل کے ساتھ یہ غزل بھی پڑھی۔ خوش نوایانِ شاہ جہاں آباد نے غزل کو پسند کیا، میاں ابراہیم کے کلام کی برجستگی، روزمرہ کی چستی اور گرمی سے بوڑھے شاعروں کے سر بھی ہلنے لگے لیکن شاہ نصیر ہر شعر پر پہلو بدلتے، چہرے پر ناراضگی کے آثار، تیوری چڑھی ہوئی، یہ محسوس ہو رہا تھا کہ شاعر کی بے باکی اور جرأت پر مزاج

کا پارہ حد سے زیادہ چڑھا ہوا ہے۔ بارے خدا خدا کر کے غزل تمام ہوئی، بہت سر سبز ہوئی۔ میاں ابراہیم نہالوں نہال ہو گئے۔

میاں ابراہیم دلّی کے دل والے تھے۔ غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ باپ معمولی سپاہی لیکن لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ حافظ غلام رسول شوق کے مکتب میں پڑھتے رہے۔ ذوق تخلص مکتب شوق ہی کی یادگار بن گیا۔ یہاں مرزا کاظم حسین بے قرار ان کے ہم درس تھے۔ وہ شعر بھی کہتے تھے۔ میاں ابراہیم بھی شعر کہنے لگے۔ دونوں حافظ غلام رسول شوقؔ سے اصلاح لینے لگے۔ پھر ذوق میاں عبدالرزاق کے مکتب پہنچے، یہاں دلّی اردو اخبار کے مدیر مولوی محمد باقر ان کے ہم درس ہوئے۔ دونوں میں ایسا اتحاد و اتفاق ہوا کہ ساری زندگی جاری و ساری رہا۔

ایک دن کاظم حسین بے قرارؔ نے جو نئی غزل سنائی اس کے اشعار بڑے گرما گرم، برجستہ اور خوش نما تھے۔ کہنے لگے ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے ہیں شہر بھر میں بس وہی ایک استاد ہیں۔ دلّی تو دلّی لکھنؤ اور دکن میں بھی ان کے نام کے ڈنکے بجتے ہیں۔ ذوقؔ بھی بیقرارؔ کے ساتھ جا کر شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔ سونا کسوٹی پر کس گیا۔ شاہ نصیر زبان، روز مرے۔ محاورے، کڈھب قافیوں اور سنگلاخ زمینوں کے استاد تھے۔

خال پشت لب شیریں ہے عسل کی مکھی

یہ اس زمانے میں دلّی کا عام رنگ تھا۔ ذوقؔ بھی اسی رنگ میں رنگ گئے۔ محنت جو کی تو رنگ اور چوکھا ہو گیا۔ ادھر ان کا رنگ نکھرنے لگا ادھر استاد بے توجہی برتنے لگے۔ نوجوان ذوقؔ استاد کی بے توجہی سے دل ہی دل میں کڑھتے مگر دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔ آہستہ آہستہ تعلقات میں بگاڑ ہو گا گیا لیکن ذوقؔ ہمیشہ استاد کی بزرگی کا دم بھرتے رہے۔ شاگرد استاد کی کشمکش جاری تھی کہ استاد کو دکن سے بلاوا ملا اور وہ سیدھے سبھاؤ راجہ چندو لال کی بزم سخن کو امتیاز بخشنے دکن سدھار لیے۔ شاہ نصیر ولی عہدِ سلطنت ابوظفر کی غزل بھی بناتے تھے۔ وہ دکن چلے گئے تو ولی عہد بہادر نے یہ خدمت کاظم حسین بیقرارؔ کے سپرد کر دی۔ ولی عہد بیچارے ان دنوں معتوب تھے۔ صرف پان سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ پانچ ہزار کے بجائے پان سو میں گزارہ کرنا پڑتا تھا۔ محلاتی سازشوں کے شکار تھے۔ کاظم حسین بیقرارؔ کو بھی الفنسٹن صاحب کے ہاں میر

منشی کی خدمت مل گئی اور وہ بھی سرکاری عہد ناموں کی تجدید کے لیے الفنسٹن کے ساتھ سندھ اور افغانستان روانہ ہو گئے۔ ولی عہد رسمی اصلاح سے بھی محروم ہو گئے۔

ایک دن ذوق قلعہ معلی گئے تو ولی عہد بہادر تیر اندازی کی مشق کر رہے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی شکوہ کیا۔ "استاد تو دکن چلے گئے، بے قرار بھی ہمیں چھوڑ گئے۔ تم نے بھی آنا چھوڑ دیا،" میاں ابراہیم نے کہا "بندہ جہاں ہو وہیں دعا کرتا ہے اور کرتا رہے گا" ولی عہد بہادر نے فرمایا "ہماری غزل کون بنائے گا" یہ کہہ کر جیب سے غزل نکال کر حوالہ کی اور کہا لو ذرا اسے دیکھ لو۔ نوجوان ذوقؔ نے پوری توجہ اور غور سے ایک ایک لفظ پڑھا، زبان کی مناسبتوں پر غور کیا، الفاظ کی نشست پر نگاہ ڈالی، مصرعوں کی چستی کی طرف توجہ کی، ہر شعر کو دشمن کی آنکھ سے دیکھ کر جانچا اور پرکھا۔ مطلع سے مقطعے تک متعدد بار ہر شعر کا جائزہ لیا۔ کہیں کوئی لفظ یا ترکیب نامناسب معلوم ہوئی تو اسے بڑی سوچ بچار کے بعد بدلا۔ پھر اصلاح شدہ غزل ولی عہد بہادر کی خدمت میں پیش کی۔ ولی عہد نے غزل کو ابتداء سے انتہا تک ملاحظہ فرمایا۔ خوشنودی کے طور پر سر کو جنبش دی۔ سپاہی زادے شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ نوجوان اور ابھرتی ہوئی غیر معمولی شعری صلاحیتوں کے حامل، ولی عہد بہادر کے استاد ہو گئے۔ قلعہ معلی میں حاضری ہونے لگی، ولی عہد کی غزل بنانے لگے۔ سارے شہر میں دھوم ہو گئی۔ ولی عہد کے حسنِ توسط سے اکبر بادشاہ ثانی کے دربار میں قصیدے پیش کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ایسے قصیدے پڑھے کہ دھاک بیٹھ گئی:

صبح سعادت، نورارادت، تن بریاضت، دل بہ تمنا
جلوۂ قدرت، عالمِ وحدت، چشمِ بصیرت، محوِ تماشا
قصر رفیع و صحن وسیع و طرز مسجع، سطح مربع
باغِ اِرم یا روضۂ رضوان، خلدِ بریں یا جنت ماویٰ

اُنّیس برس کی عمر میں ولی عہد بہادر کے استاد مقرر ہونے سے شہر میں بڑی چہ میگوئیاں ہوئیں۔ لوگ بہت جلے۔ مگر جلنے والے یہ بھول گئے کہ اسی دلّی میں چھ سو برس پہلے ایک ترک لاچین نے انیس سال کی عمر میں اپنا پہلا دیوان تحفتہ الصغر حضرت سلطان جیؒ کی خدمتِ بابرکت میں برائے دعا و اصلاح پیش کیا تھا اور اسی شاہ جہاں آباد میں آگے چل کر یہ واقعہ بھی پیش آیا

کہ ایک انیس سالہ ترک ایبک نے اپنا دیوان نظری کر دیا۔ مگر اس نظری کر دیئے جانے والے دیوان کے متعدد اشعار شاعری کی آفاقی حدوں کو چھوتے ہوئے آنے والے دور کے شعری امکانات کا واضح نشان بن گئے۔ ہفتاد و دو کو حسد کا ہم عدد قرار دیا جاتا ہے لیکن نواز دہم کے عدد "جادہ ادب" کی علامت ہیں۔

میاں ابراہیم ولی عہد کی غزلوں کی اصلاح کرنے لگے۔ اکبر شاہ ثانی کے حضور قصیدے پیش کرنے لگے۔ مشقِ سخن کے خارزار سے گزرنے لگے۔ خود ایک رقم بن گئے، نایاب اور انمول۔

بارگاہِ ولی عہدی میں استاد کی تنخواہ چار روپے مہینہ مقرر ہوئی۔ دور اندیش باپ نے کہ سرد و گرمِ زمانہ کا مزہ چکھے ہوئے تھے ازراہِ شفقتِ بزرگانہ سمجھایا "بیٹا مستقبل کا خیال کرو۔ کوئی اور کام دیکھو۔ چار روپے گزران کے لیے بالکل ناکافی ہیں۔" دل نے کہا "یہ چار روپے نہیں۔ ایوان ملک الشعرائی کے چار ستون قائم ہوتے ہیں۔" پھر ایک کا اضافہ ہوا۔ پانچ روپے ہوگئے۔ مزید اضافے ہوئے تو سات اور بعد ازاں نو ہوگئے۔ قصیدوں پر انعام و اکرام بھی ملنے لگے۔ میاں ابراہیم کے مزاج میں قناعت تھی جو مل گیا اسے غنیمت سمجھا۔

یہ شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کی شاعری اور زندگی کا آزمائشی دور تھا۔ شاہ نصیر دکن سے واپس آگئے تھے۔ انھوں نے مشاعروں کا آغاز کیا۔ بڑی مشکل اور سنگلاخ زمینیں طرح میں رکھیں۔ قفس کی تیلیاں، خس کی تیلیاں، آتش و آب و خاک و باد، ذوقؔ نے ہر طرح میں طبع آزمائی کی۔ ایسی گرما گرم غزلیں لکھیں کہ جھنڈے گاڑ دیے۔ استادی مسلّم ہوگئی۔ یہ معرکہ بھی استاد نے سر کر لیا۔

ایک مرتبہ شاہ صاحب نے طرح کی۔ گوارا ہم کو۔ کھٹکا ہم کو۔ استاد نے اڑسٹھ شعر کا دو غزلہ پڑھا اور شاہ صاحب کی بزرگی کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ شعر خصوصی طور پر پیش کیا:

کرتے جوں کوہ نہیں ہم تو سخن میں سبقت
پروہ کچھ ہم سے سنے گا جو کہے گا ہم کو

ساری محفل چونک پڑی، پھر استاد نے پڑھا:

دیکھا آخر کہ نہ پھوڑے کی طرح پھوٹ بہے
ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپ نے چھیڑا ہم کو
ہم تبرک ہیں بس اب کر لے زیارت مجنوں
سر پہ پھرتا ہے لیے آبلہ پا ہم کو

مقطع بھی بڑا پر لطف ہے ہلکی سی چھیڑ چھاڑ اور ایک نازک اشارہ ہے:

ذوقؔ بازی گہہ طفلاں ہے سراسر یہ زمیں
ساتھ لڑکوں کے پڑا کھیلنا گویا ہم کو

بڑی واہ واہ ہوئی۔ غزل اور قصیدے دونوں میں استاد کا رنگ مقبولِ خاص و عام ہو گیا۔ یہ اس زمانے کا معیاری عصری رنگِ سخن تھا۔ شعری اور ثقافتی رجحانات کا آئینہ دار تھا۔ سارے شاعر اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ لفظی مناسبتوں کی خوشنمائی، کڈھب قافیوں کی فنکارانہ سلیقے کے ساتھ شعر میں سمائی، سنگلاخ زمینوں کی کار فرمائی اور منھ سے بولتی غزلوں کی دل آرائی سے مشاعروں کی چھتیں اڑ جاتی تھیں۔ استاد غزل پڑھتے تو سارے شہر میں چرچا ہو جاتا۔ باہر سے آنے والے استاد کا کلام تحفے کے طور پر اپنے یہاں لے جاتے۔ زبان کے دوسرے مستند مرکز لکھنؤ میں بھی استاد کی غزلیں سکّہ رائج الوقت قرار پائیں۔

استاد کی سخن سنجی میں ولولہ اور جوش تھا۔ اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ایسا قصیدہ پڑھا جس کے اٹھارہ اشعار مختلف زبانوں میں تھے۔ بارگاہِ شاہی سے خاقانیِ ہند کا خطاب عطا ہوا۔ ایک بار پھر استادانِ فن اور خوش نوایانِ سخن کے تلووں سے لگی تو سر تک پہنچی۔ مگر اس آگ کو بھی میر کلّو حقیر نے ٹھنڈا کیا، انھوں نے کہا ”بھئی انصاف شرط ہے۔ وہ قصیدہ بھی تو دیکھو جس پر خطاب عطا ہوا ہے۔ خالی خولی جلنے اور سلگنے سے کیا حاصل۔“ قصیدہ جس نے بھی دیکھا اور انصاف کو بھی مد نظر رکھا اسے ماننا پڑا کہ ایسا قصیدہ جس کا ہر شعر سراپا انتخاب ہو نظر سے نہیں گزرا۔ تشبیہہ لاجواب، نادر شوکتِ الفاظ کا شاہکار، گریز میں غیر معمولی برجستگی اور بے ساختگی۔ ایسی برمحلی کہ ذہن خود بخود مدح کی طرف منتقل ہو جائے۔ مدح پر وقار، سراپا بہار، دعائیہ اشعار، موزوں اور برمحل۔ سارے شہر میں دھوم ہو گئی۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق خاقانیِ ہند ہو گئے۔ انھیں دنوں دلّی

میں ایک خواب کا بڑا چرچا ہوا، زبان زد و خاص و عام ہوگیا۔ حافظ احمد یار شہر کے معروف حافظ تھے۔ بزمرہ حافظاں دربار سے بھی وابستہ تھے۔ سیّد انشاؔ سے گاڑھی چھنتی تھی۔ انھوں نے بیان کیا کہ میں نے خواب دیکھا کہ ایک جنازہ رکھا ہوا ہے۔ بہت سے لوگ جمع ہیں۔ سید انشاء اس مجمع میں برہنہ سر کھڑے ہیں۔ اتنے میں میرے والد حافظ عبدالرحیم نے انشاؔ کے کان میں کچھ کہا، انھوں نے دودھ کا ایک پیالہ میاں ابراہیم کو دیا اور کہا اسے پی جاؤ۔ میاں ابراہیم نے تامل کیا۔ اس پر میرے والد خود بڑھے اور کہا پی لو۔ میاں ابراہیم نے دودھ پی لیا۔ معلوم ہوا کہ جنازہ مرزا محمد رفیع سوداؔ کا ہے اور میاں ابراہیم ان کے جانشین مقرر ہوئے ہیں۔ یہ مسرت و غم کی تعبیر والا خواب نہیں تھا۔ طالع بیدار کی وسعت اور ترقی کا خواب تھا۔

آخر کار ایک دن گھی کا کپّا لنڈھ گیا۔ اکبر شاہ ثانی راہی عالم بقا ہوئے۔ ولی عہد مرزا ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ ثانی کے لقب سے سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ استاد ذوق استادِ شاہ ہوگئے۔ تنخواہ ۳۰ روپے ماہوار ہوگئی۔ پہلے سال جلوس کا قصیدہ اس دھوم دھام اور کیف و مستی میں ڈوبے ہوئے انداز میں پڑھا کہ آج تک موسیقیت اور حسن الفاظ کا شاہکار سمجھا جاتا ہے:

ہے آج جو یوں خوش نما نورِ سحر رنگِ شفق
پر تو ہے کس خورشید کا نورِ سحر رنگِ شفق
ہر سروقد غنچۂ دہن زیبِ چمن شانِ چمن
ہر سیم پر گلگوں قبا نورِ سحر رنگِ شفق
افشاں جبیں پر سر بسر مہتاب و انجم جلوہ گر
اور گورے ہاتھوں میں حنا نورِ سحر رنگِ شفق
جشنِ بہادر شاہ ہے روزِ علوئے جاہ ہے
ہے اس لیے بہجت فزا نورِ سحر رنگِ شفق

قصیدہ کاہے کو ہے نورِ سحر رنگِ شفق ہے۔ از اول تا آخر نورِ سحر رنگِ شفق اور اس پر مستزاد سلاست، ترصیع، الفاظ کی میناکاری، روانی اور برجستگی۔

اردو قصیدہ گوئی میں دو نام مستند اور منفرد ہیں مرزا محمد رفیع سوداؔ اور شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ۔

لڑکپن میں سودا کی غزل پر غزل کہنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذوقؔ کو طرز و روشِ سوداؔ سے طبعی مناسبت تھی۔

تاہم یہ بات بھی واضح ہے کہ دونوں باکمالوں کا انداز ایک دوسرے سے بالکل الگ ہے۔ سودا مضمون آفرینی، تعمق اور حسنِ خیال کے اُستاد ہیں۔ نئے سے نیا مضمون لاتے ہیں۔ تشبیب میں خیال آرائی کا طلسم خانہ تعمیر کرتے ہیں، گریز، مدح، دعاسب میں نئے پن کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ مدح اور قدح دونوں پر یکساں طور سے قادر ہیں۔ ہجویہ قصائد میں طنز و استہزا کے نشتر چلاتے ہیں۔ پھبتیاں کستے ہیں، چٹکیاں لیتے ہیں، قہقہے لگاتے ہیں۔ ذوق بالعموم بہاریہ تشبیہوں سے اپنی انفرادیت، جدتِ طبع و شعری مہارت کا اظہار کرتے ہیں، موسیقی ترنم نشست الفاظ کی دلکشی اور موزونی سے اپنے قصائد کو رواں دواں رکھتے ہیں۔ علمی اصطلاحوں سے قصیدے میں علمی شان پیدا کرتے ہیں۔

سوداؔ کے قصیدے کراچی کی رواں دواں ونگینیں ہیں، برق رفتاری سے دوڑتی جھپٹتی ہوئی، دوسروں کو نیچاد کھاتی ہوئی ٹھسا ٹھس بھری ہوئی۔ چھتوں پر بھی مسافر ہی مسافر، سیڑھی سے لٹکے، کاندھے سے کاندھا جڑا ہوا ہے۔ اندر بیٹھے مسافروں میں سجہ گردانی بھی ہے کھینچا تانی بھی ہے مگر سب خوش و خرم چلے جارہے ہیں۔

استاد ذوق کے قصیدے بی ایم ڈبلیو ہیں۔ نکھ سے سکھ درست، سبک ہوا سے باتیں کرنے والی۔ بیٹھنے والوں میں اے سی کی نرم ولطیف خنکی کا احساس، مفرحِ خت رواں۔

آہستہ آہستہ شہر میں مقابلے کی فضا ختم ہوگئی۔ شاہ نصیر دکن گئے تھے، وہیں کی خاک کا پیوند ہوگئے۔ استاد کے سب سے بڑے حریف شاہ نصیر کے صاحبزادے وجیہ الدین منیرؔ جواں مرگ ہوئے۔ استاد کا دریائے سخن جوش و خروش دکھاتا رہا۔ دکن سے بھی بلاوے آنے لگے مگر انھوں نے دلّی کی گلیوں کو چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔

گرچہ ہے ملک دکن میں ان دنوں قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلّی گلیاں چھوڑ کر

ایک جشن کے موقع پر استاد نے ایک قصیدہ نذر گزرانا۔

شب کو میں اپنے سر بستر خوابِ راحت
نشۂ علم میں سر مستِ غرور و نخوت

شوکتِ الفاظ کا مرقع اور علم و آگاہی کا بیان ناطق ہے۔ جہاں پناہ نے پسند کیا اور خلعت معمولی کے علاوہ ایک گاؤں جاگیر میں عطا ہوا۔

ایک دفعہ بہادر شاہ بیمار ہوئے۔ شفا پائی۔ غسلِ صحت ہوا۔ استاد نے صحت یابی پر تہنیتی قصیدہ پیش کیا۔ بارگاہِ سلطانی سے خلعت خان بہادر کا خطاب اور ایک انعام ہاتھی مع حوضۂ نقرئی انعام ہوا۔ کابلی دروازے کے قریب ایک چھوٹے سے مکان میں زندگی بسر کرنے والے استاد نے ہاتھی کہاں باندھا ہوگا۔ شیخ سعدی نے کیا اچھا کہا ہے۔

دوستی باپیل باناں یا مکن
یا طلب کن خانہ دوخورد پیل

استاد کے ایک نامور ہم عصر حکیم مومن خاں مومن کو بھی پٹیالے والے راجا چیت سنگھ نے ایک ہتھنی انعام دی تھی۔ دلّی کے کسی مسخرے شاعر نے اس پر مومن خان کی ہجو بھی کہی تھی:

جہنموں میں وہ مومن مکان لیتا ہے
نجومی بن کے جو ہتھنی کا دان لیتا ہے

مگر استاد کو بارگاہِ سلطانی سے ہاتھی عطا ہوا تھا اس لیے کسی نے دم نہیں مارا۔

استاد بادشاہ کے استاد بھی تھے، دوست بھی تھے۔ ہم دم و ہمراز بھی تھے۔ بادشاہ بھی انھیں بہت عزیز رکھتے تھے جانتے تھے کہ سیدھے سادے آدمی ہیں کسی کاٹ پھانس میں نہیں، کسی کے نصب میں دخل نہیں دیتے، اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے ان پر بھروسا کرتے تھے، ان کی بات کو اہمیت دیتے تھے۔ ان کے بیٹے محمد اسماعیل کو وقار الدولہ خان بہادر کا خطاب دے کر دربار کی کچھ خدمتیں ان کے سپرد کی تھیں۔ ان کے رسوخ سے سب ڈرتے تھے، بیگم بھی اور حکیم احسن اللہ خان بھی۔

دنیا کا قاعدہ ہے کہ جب شاہ کسی کو عزیز رکھتا ہے تو متوسلین درپردہ زک پہنچانے کی

کوشش میں لگے رہتے ہیں تا کہ وہ پایۂ اعتبار سے گر جائے، بے وزن ہو جائے، اپنی اپنی سی کرتے رہتے ہیں۔ جہاں پناہ کی بیگم تھیں زینت محل۔ چہیتی بیگم تھیں، چندے آفتاب چندے ماہتاب اور کارِ سلطنت میں برق تاب۔ انھیں بادشاہ کے حضور استاد کا رسوخ بڑا گراں گذرتا تھا۔ ایک دفعہ انھوں نے استاد کو نیچا دکھانے کے لیے یہ کہا کہ "استاد اب کے جشن کی مبارکباد کا قصیدہ پڑھیں تو دربار میں کوئی ان کے شعروں پر تعریف نہ کرے" مرزا علی عرض بیگی نے استاد کو پیغام بھیجا کہ بیگم صاحبہ نے یہ حکم دیا ہے کہ "کل استاد قصیدہ سنائیں تو سب چپ بیٹھے رہیں۔ آپ کو خیال رہے۔" پیغام رساں رخصت ہو گیا تو استاد نے شرربار سانس کھینچی کہنے لگے "اس بیگم کو کیا ہو گیا ہے۔ خدائی کے مُنھ بند کرتی ہے۔ میں جب قصیدہ پڑھوں گا تو دیوانِ خاص کے درودیوار سے واہ واہ لوں گا۔"

صبح استاد دربار میں حاضر ہوئے۔ وقتِ مقرر پر حسبِ ارشادِ جہاں پناہ، قصیدہ شروع کیا، تمام دربار دم بخود سب کے سب مُنھ میں گھنگنیاں بھرے بیٹھے۔ جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ مطلع پڑھا۔ پہلا شعر پڑھا صدائے برنخواست، دوسرا شعر پڑھا فضا خاموش، تیسرا شعر پڑھا سب چپ، چوتھے پر بھی وہی خاموشی، پانچواں اور چھوٹا شعر بھی صاف گیا۔ ساتواں شعر پڑھا تو بادشاہ نے اشارہ کیا آگے آؤ سر جھکاؤ ہاتھ پھیلا کر گلے لگا لیا ارشاد ہوا "ہوں" یعنی مکرر پڑھو۔ پھر تو دریا کا بند ٹوٹ گیا۔ کہاں تو سب کے سب چپ تھے کہاں دادو تحسین کے ڈونگڑے برسنے لگے۔ استاد نے سچ کہا تھا دیوانِ خاص کے درودیوار واہ واہ کرنے لگے۔ بیگم کو خبر ہوئی۔ پانسہ پلٹ گیا۔ سناٹے میں آگئیں۔ استاد کا شعر یاد آگیا:

رندِ خرابِ حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

کیا کرتیں کلیجہ مسوس کر رہ گئیں۔ بیگم محبت اور نفرت دونوں میں عمیق تھیں۔ محبت ایسی کہ مظلوم شوہر کے ساتھ رنگون چلی گئیں۔ شوہر کے ہوتے ہوئے مرگِ سلطنت پر رنڈاپے کا سفید جوڑا پہن لیا۔ ساری زندگی اسی میں گذار دی۔ نفرت اس بلا کی کہ استاد کو نیچا دکھانے کا خیال دل سے محو نہ ہوا۔ اللہ نے موقعہ بھی فراہم کر دیا۔ سنہرا موقعہ۔ ہوا یہ کہ بیگم کے نورِ نظر

لختِ جگر مرزا جواں بخت کی شادی ہوئی۔ مرزا جواں بخت ماں کی وجہ سے باپ کے بھی چہیتے۔ ان کی ولی عہدی کی بڑی کوششیں ہوئی مگر کمپنی بہادر نے ایک نہ مانی۔ شادی بڑی دھوم دھام اور تزک واحتشام سے ہوئی۔ مغل فرمان رواؤں میں آخری شادی تھی۔ رقص و سرور کی محفلیں دس بارہ دن تک گرم رہیں۔ کل ملازمین شاہی اور رؤسائے شہر کے واسطے توروں کا حکم ہوگیا۔ ایک تورے میں طعام اس قدر ہوتا تھا کہ ایک محفل شکم سیر ہو کر کھانا کھالے۔ ایک طباق میں پانچ پانچ سیر کھانا ہوتا تھا۔ چار چار پانچ پانچ طرح کے پلاؤ، رنگ برنگ میٹھے چاول، سرخ، سبز، اودے، پانچ سیر کی باقر خانی ایک شیریں، ایک نمکین کئی قسم کے نان۔

شادی اور ایسی دھوم دھام کی شادی۔ بیگم کے ایما سے مرزا غالب نے کہ خاندانِ تیموریہ کی تاریخ مرتب کرنے پر مامور ہو چکے تھے، مرزا جواں بخت کا سہرا کہا۔ زرنگار کاغذ پر لکھوایا۔ سونے کی کشتی میں رکھ کر حضور میں پیش کر دیا۔ بیگم کی شہ ہو یا مرزا کی انانیت۔ مقطع یوں تھا:

ہم سخن فہم میں غالبؔ کے طرف دار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

حضورِ جہاں پناہ نے مقطع دیکھا۔ خاموش رہے۔ استاد دربار میں حاضر ہوئے تو وہ سہرا دیا کہ "استاد ذرا اسے دیکھیے۔" استاد نے سہرا پڑھا عرض کیا "پیر و مرشد درست" ارشاد ہوا "آپ بھی ایک سہرا کہہ دیں" عرض کی "بہت خوب" پھر ارشاد ہوا "ابھی کہہ دیجیے۔ مقطع بھی دیکھ لیجئے" استاد نے وہیں برجستہ سہرا لکھا۔ مقطعے میں یہ انداز اختیار کیا۔

جن کو دعوئ ہے سخن کا یہ سنادو اُن کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

سارے شہر میں دھوم ہوگئی۔ اربابِ نشاط حضور میں ملازم تھیں۔ سہرا اُسی وقت انھیں ملا۔ شہر کی گلی گلی کوچے کوچے میں پھیل گیا۔ بیگم کا وار خالی گیا مرزا کو بھی احساس ہو گیا کہ

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعث افزائش دردو دروں وہ بھی

قطع معذرت لکھا:

استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
مقطعے میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو رو سیاہ
سودا نہیں، جنون نہیں، وحشت نہیں مجھے

اس انانیت پسند پر کیا گزری ہوگی جس نے درکعبہ کو بند پاکر الٹے پھر آنے کو ترجیح دی تھی اور بندگی میں آزادگی و خود بینی کا بھرم قائم رکھا تھا۔ اس روحانی کرب کا اندازہ آج بھی ممکن ہے۔ ویسے مرزا تفنن طبع کے طور پر استاد سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

استاد سنتے اور پہلو میں رکھ لیتے۔ انھوں نے صرف ایک دفعہ چھیڑ کی تھی۔ چھیڑ کیا تھی معاصرانہ چشمک کا اظہار تھا۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

مرزا غالبؔ کو اس واقعہ کا ملال رہا۔ یہ احساس ہوا کہ بہادر شاہ ان سے کھنچ گئے ہیں، دل میں گرہ پڑھ گئی ہے۔ چنانچہ اگلے جشن پر قصیدہ پیش کیا۔ اس کی ردیف گرہ رکھی اور شروع یوں کیا۔

ردیف شعر ازیں کردم اختیار گرہ
کہ از منست بر ابروئے شہریار گرہ

(میں نے شعر کی ردیف گرہ یوں اختیار کی ہے کہ میری جانب سے شہریار کے ابرو پر گرہ

پڑگئی ہے)

ایک بیگم ہی پر کیا منحصر، کرم فرما تو اور بھی بہت تھے۔ استاد کے رسوخ سے کوئلوں پر لوٹتے تھے۔ اپنی سی کرتے رہتے تھے۔ بہادر شاہ بادشاہ ہوئے تو مرزا مغل بیگ کو وزارت عظمیٰ ہاتھ آئی۔ استاد سے کھنساتے تھے۔ کاٹ کرتے رہتے تھے۔ استادِ شاہ کی تنخواہ میں اضافہ کیا تو تیس روپے کر دیے۔ اوسوں سے پیاس کہاں بجھتی ہے مگر استاد قناعت کے پیکر تھے۔ نہ شکوہ نہ شکایت۔ مغل بیگ کی ترکی تمام ہوئی۔ پورے کنبے کے ساتھ قلعے سے نکال دیے گئے۔ استاد کی تنخواہ پچاس روپے ہوگئی۔ آخر آخر میں سو ہوگئی تھی مگر استاد تھے کہ ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے، چار روپے میں بھی خوش تھے اور سو روپے میں بھی مطمئن۔

برجستگی اور تازہ کاری کی پھلجڑیاں چھوڑتے رہتے۔ ادھر کسی کی زباں سے کچھ نکلا اور انھوں نے اسے شعر کا جامہ پہنایا۔ ادھر کسی نے مصرع پڑھا اور ادھر انھوں نے اس پر پھڑکتا ہوا مصرع لگا دیا۔

ایک دن معمولی دربار تھا، استاد بھی حاضر تھے۔ ایک مرشدزادے تشریف لائے۔ انھوں نے آہستہ آہستہ بادشاہ سے کچھ کہا اور رخصت ہوئے۔ حکیم احسن اللہ خان کہ وزیر اعظم اور بادشاہ کے معتمد خاص تھے دربار میں حاضر تھے۔ انھوں نے عرض کی "صاحب عالم! اس قدر جلدی۔ یہ آنا کیا تھا اور تشریف لے جانا کیا تھا۔ انھوں نے کہا "اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے۔" بادشاہ نے استاد کی طرف دیکھ کر فرمایا "استاد دیکھنا کیا صاف مصرع ہوا ہے" استاد نے برجستہ پڑھا۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے
ہو عمرِ خضر بھی تو کہیں گے بوقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

دنیا نے کس کا راہ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے
جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوقؔ
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

برجستگی اور ایسی برجستگی، سہل ممتنع کا جادو، قلعہ معلی کی زبان کی خوشبو، روز مرہ شاہ جہاں آباد کی گفتگو، سادگی کی خو بو، روانی میں آب جو، مجاز کے پیرائے میں حقِ سرہ، بہادر شاہ کے عہد میں استاد کا کلام اربابِ نشاط نے گایا تھا۔ بیسویں صدی میں پردہ سیمیں کے ممتاز فنکار کندن لال سہگل نے یہ غزل گا کر استاد کو خراج تحسین پیش کیا۔ سہگل کا گراموفون ریکارڈ آج بھی موجود ہے۔ دونوں چلے گئے مگر شعر اور آواز کا جادو باقی ہے۔

ایک دن استاد معمول کے مطابق دربار گئے۔ مرشد زادے مرزا شاہ رخ تشریف رکھتے تھے۔ انھوں نے استاد کو دیکھتے ہی کہا، "لیجیے وہ بھی آ گئے" قصہ یہ تھا کہ حضور جہاں پناہ کی ایک غزل کے ہر شعر میں مصرع لگا کر مثلث کرنا چاہتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ مصرع شعر کے اوپر نہ لگے۔ نیچے لگے۔ یعنی رواج قدیم کی پیروی نہ ہو۔ نئی اختراع ہو۔ جہاں پناہ نے وہ غزل استاد کے حوالے کی اور ارشاد ہوا، "استاد اس پر مصرعے لگا دو"۔ استاد نے قلم اٹھایا۔ ایک شعر پر نگاہ ڈالی۔ فوراً مصرع لگا دیا پھر دوسرے تیسرے یہاں تک کہ ہر شعر پر مصرعے لگا دیئے اور اسی وقت پڑھ کے سنا دی۔

یا تو افسر مرا شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
ورنہ ایسا جو بنایا نہ بنایا ہوتا
نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو
عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
دل کو میرے خم و خم خانہ بنایا ہوتا

اس خرد نے مجھے سرگشتہ و حیران کیا
کیوں خردِ مند بنایا نہ بنایا ہوتا
تو نے اپنا مجھے دیوانہ بنایا ہوتا
روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفرؔ
ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا
بلکہ بہتر تو یہی تھا نہ بنایا ہوتا

سب حیران رہ گئے بلکہ مرزا شاہ رخ نے کہا "استاد کیا آپ گھر سے کہہ کر لائے تھے" بادشاہ بولے "انھیں کیا خبر تھی یہاں کیا ہو رہا ہے۔"

فتح الملک، مرزا فخرو، ولی عہد بہادر استاد کے تلامذہ میں شامل تھے۔ بادشاہ کے ساتھ قطب خاص میں تھے۔ چاندنی کھلی ہوئی۔ تلاؤ کے کنارے چاندنی کی بہار دیکھ رہے تھے۔ استاد بھی پاس ہی کھڑے چاندنی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ تلاؤ میں چاندنی کا عکس دیکھ کر مرزا فخر و جھوم اٹھے۔ زبان سے بے اختیار مصرع نکلا "چاندنی دیکھے اگر وہ مہ جبیں تالاب پر۔" مصرع پڑھ کر ولی عہد بہادر نے استاد کی طرف دیکھا اور کہا "استاد اس مصرع پر مصرع لگا دیجیے۔" یہاں کیا دیر تھی استاد تو بہتے دریا تھے، فوراً کہا:

چاندنی دیکھے اگر وہ مہ جبیں تالاب پر
عکسِ رخ کی تاب پانی پھیر دے مہتاب پر

کیا مصرع ہے، کیا مناسبتیں ہیں، کیا تلازمے ہیں۔ تاب، تالاب، پانی، عکس، مہتاب۔ کیا رعایتیں اور صنعتیں ہیں۔ ایسے ہی برجستہ مصرعے استادانہ شاعری کی آبرو بنتے ہیں۔

ایک دن ایک باپ بیٹے استاد کے یہاں آئے۔ باپ غلام محمد بیٹے غلام علی۔ استاد سے فرمائش کی "ہمارے نام کا سجع کہہ دیجئے" استاد نے کہا "اچھا کہہ دیں گے۔" وہ دونوں عرض مدعا کے بعد رخصت ہوئے ڈیوڑھی سے نکلے ہی تھے کہ استاد نے ملازم کو آواز دی "محمد بخش ذرا دوڑو انھیں بلاؤ۔ خوب ہوا۔ ان کے تقاضے سے جلدی مخلصی ہوگئی۔" شاگردِ رشید محمد حسین آزاد بیٹھے تھے انھیں دیکھ کر پڑھا "پدر غلام محمد پسر غلام علی" کیا خوبصورت سجع ہے ڈھلا ڈھلایا، رواں اور

برجستہ۔ یہ لطیفے روز ہوتے رہتے تھے۔

میاں محبوب ایک خواجہ سرا تھا۔ بیگم اُس پر بڑی مہربان تھیں۔ چنانچہ میاں محبوب بڑھتے بڑھتے میاں صاحب ہوگئے۔ بیگم کو عروج حاصل ہوا تو محبوب نواب، محبوب علی خان ہوگئے۔ محل کے ساتھ مقدمات دربار کے اختیار بھی انھیں حاصل ہوگئے۔ سفید، سیاہ، موقوفی اور بحالی سب انھیں کی مرضی پر منحصر۔ جوئے کی لت تھی۔ شہر کے نامی نامی جواری ان کے پاس بھرے رہتے تھے۔ ایک بار جہاں پناہ ان سے ناراض ہوئے۔ بہت ناراض ہوئے انھوں نے مشہور کر دیا کہ میں حج کو جاتا ہوں۔ استاد کے کسی دوست نے انھیں اطلاع دی کہ میاں صاحب حج کو جارہے ہیں۔ دوسرے بولے، جاتا ہے نہ آتا ہے بس یونہی سنا کیجیے۔ اتفاق سے محمد حسین آزاد استاد کی خدمت میں حاضر تھے۔ استاد نے دوستوں کی باتیں سنیں تو برجستہ کہا اور آزاد نے لوح دل پر لکھ لیا۔

جو دل قمار خانہ میں بت سے لگا چکے
وہ کعبتین چھوڑ کے کعبے کو جا چکے

سترہ شعر کی غزل ہوگئی۔ مقطع بھی کیا خوب صورت کہا ہے:

مسجد میں بیٹھے کیا ہو چلو مے کدے کو ذوقؔ
اٹھو کہیں وظیفہ بہت بڑبڑا چکے

استاد کی زندگی ان کی شاعری سے عبارت تھی۔ دربار میں ہیں تو برجستہ شعر کہہ رہے ہیں۔ گھر پر ہیں تو فکر شعر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ شاگردوں کے مجمع میں ہیں تو شعر کہہ رہے ہیں۔ سیدھی سادی زندگی تھی۔ ایک ڈھرے پر چلتی رہتی تھی۔ دربار گئے۔ شام کو شاگردوں کے حلقے میں بیٹھے ہیں۔ گھر کی تنگ انگنائی میں کھری چارپائی پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے ہیں۔ کتاب دیکھتے جاتے ہیں، حقہ گڑگڑاتے جاتے ہیں۔

حقہ کا شوق اور طلب بھی عجیب ہے۔ ایک صبح معمول سے پہلے آنکھ کھل گئی۔ صبح صادق میں کچھ دیر تھی۔ آنکھ کھل گئی تو استاد کو حقے کی طلب ہوئی۔ دو تین دفعہ محمد بخش کو آواز دی مگر وہ مردوں سے شرط باندھے غافل سو رہا تھا۔ ناچار خود اٹھے۔ حقہ تازہ کیا، چلم اٹھائی، گنگری رکھی،

تمباکو جمائی، توار کھا، حقے کے لیے ڈھاک کے کوئلے خاص طور پر منگواتے تھے وہ قاعدے سے جمائے۔ سارے تتنبے ہو گئے مگر آگ کہاں سے آئے۔ گھر کا گھر غافل۔ معاً خیال آیا کہ نکڑ پر جو حلوائی ہے اُس نے دودھ گرم کرنے اور جلیبیاں تلنے کے لیے بھٹی جلائی ہوئی ہوگی۔ چلو دو چنگاریاں وہاں سے لے لیں۔ استاد چلم ہاتھ میں لیے گھر سے نکلے۔ ذہن میں ایک مصرع آگیا۔ دو قدم آگے بڑھے تو مطلع ہو گیا۔ چلم ہاتھ میں لیے ناخن سے کُھٹ کُھٹ کرتے مصرعے پر مصرعہ کہتے استاد دوڑتے چلے گئے۔ صرف ایک لنگوٹی بندھی ہوئی تھی ننگے بدن چلم ہاتھ میں لیے کُھٹ کُھٹ کرتے استاد اشعار کی رو میں قلعی معلی پہنچ گئے۔ دربان نے دیکھا تو مگر استاد شاہ کو روکنے کی ہمت کیسے کرتا۔ جب استاد لال پردے پر پہنچ گئے تو ہوش آیا کہ بدن سے ننگے ہیں لنگوٹی بندھی ہوئی ہے اور شعر گنگنا رہے ہیں۔ استاد اس تحیر میں تھے ادھر جہاں پناہ کو خبر ہو گئی۔ وہ فوراً بر آمد ہو گئے۔ استاد کو دو شالہ اُڑھایا گیا اور جہاں پناہ نے اُن اشعار کے سننے کی فرمائش کی جن کی آمد کا جوش استاد کو دوڑائے لیے آیا تھا۔ اشعار ہو چکے تو استاد بہ اعزاز تمام شاہی سواری میں گھر پہنچا دیے گئے۔

امیر امراء "فقدان راحت" سے گھبراتے ہیں۔ استاد من چنگا تو کھٹوتی میں گنگا کے قائل تھے۔ چھوٹا سا مکان، تنگ انگنائی۔ چارپائی بچھی ہے تو چلنا مشکل مگر خوش اور مطمئن بیٹھے ہیں۔ ایک دنیا آرہی ہے، دوست احباب گھبراتے ہیں۔ کہتے ہیں "بھئی یہاں سے نکلو" مگر نکلے وہ جسے کروفر دکھانا مقصود ہو۔ بہت ہوا تو تیس ہزاری باغ میں ٹہلنے چلے گئے۔ گھنٹوں ٹہلتے رہتے تھے، غزلیں کہتے رہتے تھے، قصیدے لکھتے رہتے تھے۔ ایک دن تیس ہزاری میں محمد حسین آزادؔ کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ غزل کہہ رہے تھے، تیر ہمیشہ تدبیر ہمیشہ۔ ایکا ایکی آزادؔ کی طرف رُخ کیا بولے "میاں محمد حسین تم بھی کچھ کہا کرو۔" آزادؔ نے کہا "کیا عرض کروں" استاد کہنے لگے بھئی کچھ ہوں ہاں، کچھ غوں غاں۔ یونہی کہنا آتا ہے۔ آزاد نے تھوڑے سے تامل کے بعد کہا، "سینے سے لگائے تری تصویر ہمیشہ۔ استاد بولے بالکل ٹھیک ہے، لکھو

آجائے اگر ہاتھ تو کیا چین سے رہیے
سینے سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

تنگ انگنائی کے اسی چھوٹے سے مکان میں بڑے بڑے آتے تھے۔ مومن خان جیسے نازک خیال اور نفیس مزاج ایک دن استاد سے ملنے آئے۔ تازہ کلام کی فرمائش کی۔ استاد نے عذر کیا، "حضور کی غزلیں فرصت کہاں دیتی ہیں جو اپنی فکر کروں۔" مومن خان نے اصرار کیا۔ استاد نے مطلع پڑھا:

بلبل ہوں صحن باغ سے دور اور شکستہ پر
پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

مومن کہنے لگے، "اس پر کوئی مطلع کیا کہے گا"۔ ایک دن اور مومنؔ نے فرمائش کی۔ "کچھ ان دنوں کا کہا ہوا سنایئے"۔ استاد نے دو شعر سنا دیئے انھیں دنوں کہے تھے۔

خط بڑھا کا کل بڑھی، زلفیں بڑھیں گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے
بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے رکتا ہے دل
اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے

مطلع ضرب المثل اور شعر قیامت ہے۔ "خط کاکل۔ زلف۔ گیسو"۔ کی انفرادی معنویت سے استاد کی مہارتِ زبان کا احساس ہوتا ہے۔ عام قاری تو ان چاروں کو ایک ہی گردانتا ہے لیکن ان میں جو فرق ہے وہ زبان کا ماہر ہی سمجھ سکتا ہے۔ استاد کی لسانی عظمت بھی اسی وقت آشکار ہوتی ہے جب ہر لفظ کے معنی پر عبور ہو۔

چھوٹے سے مکان میں شہد کی نہر جاری تھی۔ مبتدی بھی آتے، پختہ کار بھی آتے۔ سب یکساں شیریں کام ہوتے۔ استاد کو نہ خس خانہ و برفاب کی چاہ تھی اور نہ فقدانِ راحت سے گھبراتے تھے۔ ان کا خس خانہ و برفاب ان کے اشعار اور ان کی راحت ان کی شاعری۔ نہ تنخواہ ماہ بماہ نہ ہونے کا غم۔ انھوں نے قصیدے لکھے۔ خوب لکھے۔ صلے بھی ملے۔ خوب ملے لیکن دست سوال کبھی نہیں پھیلایا۔ بادشاہ کے استاد تھے۔ مُنہ چڑھے تھے لیکن مُنہ کی کھانے کا کوئی کام نہیں کیا۔ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی نے اپنی ایک مبارک مجلس میں شعر و شاعری کے حوالہ سے یہ شعر ارشاد کیا۔

شعر در وصف حال لیس سرہ ایست
چوں بخواہش رسید مسخرہ ایست

استاد کا عمل اسی پر تھا۔ شعر و شاعری ان کے لیے تکمیل و تعمیلِ خواہش کا ذریعہ نہیں تھی۔ ذہنی بالیدگی اور ارتقاع کا اظہار تھی۔ تنگ انگنائی میں بیٹھ کر انھوں نے فکر و خیال کی جو وسعت پیدا کرلی تھی وہ عالی شان ایوانوں اور قصرِ رفیع و صحنِ وسیع میں میسر نہیں تھی۔ زندگی بھر میں صرف ایک مرتبہ تقاضائے بشری نے انھیں روہانسا کیا۔ وہ بھی کسی دنیادار کے سامنے نہیں، ایک مردِ بزرگ کی خدمت میں حاضری کے موقعے پر۔ دلّی میں ایک بزرگ تھے میاں عبدالعزیز۔ فراش خانے کی کھڑکی میں رہتے تھے۔ صاحب نسبت بزرگ تھے۔ استاد ان کے عقیدت مند تھے، بڑا اعتقاد تھا۔ ایک دن ان کے پاس گئے تو شکایتاً کہنے لگے، "تخت نشینی سے پہلے حضور کے بڑے بڑے وعدے تھے۔ اب یہ عالم ہے کہ الف کے نام نہ جاننے والے مرزا مغل، جن کی زبان تک درست نہیں، سب کچھ وہی ہیں۔ میاں صاحب نے کہا "خدائی کے کارخانے ہیں۔ عقل ظاہر بیں کام نہیں کرتی مگر یہ دیکھو کہ جو دولت تم کو دی ہے وہ اس کو کہاں دی ہے؟ جس وعدے سے تم دربار میں کھڑے ہو کر اپنا کلام پڑھتے ہو۔ کیا اس وعدے سے وہ اپنی وزارت کے مقام پر کھڑا ہو سکتا ہے؟ ادنی منشی، متصدی، اس کے لکھتے پڑھتے ہوں۔ وہ کیسا ترستا ہوگا کہ نہ ان کے لکھے کو سمجھ سکتا ہے نہ ان کا جھوٹ سچ معلوم کر سکتا ہے۔" بھلے آدمی کو ایک بات۔ استاد نے توقع کا دروازہ ہی بھیڑ دیا۔ یہ کہہ کر خاموش ہوگئے۔

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہوگا
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ کہ ہوا ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا ترے کرم سے ہوگا

ماں باپ اپنی اولاد جسمانی اور شاعر اپنی اولاد معنوی کی دل و جان سے حفاظت کرتے ہیں۔ ہتھیلی کا پھپھولا بنا کر رکھتے ہیں۔ شعراء دیوان مرتب کرتے رہتے ہیں۔ اشاعت کی فکر میں سرگرداں رہتے ہیں۔ استاد کے زمانے میں اشاعت کی سہولت میسر تھی لیکن عجب بے پروا اور

بے نیاز فن کار تھے۔ غزل کہی۔ قصیدہ لکھا۔ جن کاغذوں پر لکھا وہ اٹھا کر طاق میں رکھ دیئے گئے۔ حفاظت میں حفاظت اور احتیاط میں احتیاط یہ ہوئی، جب طاق میں گنجائش نہ رہی تو کسی ٹھلیا میں بھر دیئے گئے۔ اندر بھجوا دیے گئے کہ منکے میں رکھ دیے جائیں۔ جب فرصت ہوگی تو صاف کریں گے۔ نظر ثانی کریں گے۔ محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر استاد کے بڑے گاڑھے دوست تھے۔ ہم مکتب تھے۔ برادرانہ تعلقات تھے۔ وہ آتے تو جو کچھ مل جاتا لے جاتے۔ اپنے دہلی اردو اخبار میں شائع کر دیتے۔ وہ استاد کے کلام کو جان برابر رکھتے اور فرزند رشید محمد حسین آزادؔ چھٹپن سے کلام استاد کے حافظ تھے۔ مگر کلام نہ ڈھنگ سے جمع ہوا، نہ دیوان مرتب ہوا، نہ استاد کی زندگی میں دیوان جمع ہونے اور شائع ہونے کی نوبت آئی۔ خود ہی کہہ دیا تھا۔

ذوقؔ کیوں کر ہو اپنا دیوان جمع
کہ نہیں خاطرِ پریشان جمع

مگر اندر کی بات تو ہے وہ یہ ہے۔

ذوقؔ مرتب کیونکر ہو دیوان شکوہ فرصت کس سے کریں
باندھے گلے میں ہم نے اپنے آپ ظفرؔ کے جھگڑے ہیں

استاد کے انتقال کے بعد بعد ان کے فرزند وقارالدولہ محمد اسمٰعیل فوقؔ نے محمد حسین آزادؔ کی مدد سے دھیرے دھیرے استاد کے کلام کی تدوین شروع کی۔ رفتار بہت سست تھی۔ پھر یہ ہوا کہ دلّی لٹ گئی۔ تیموری چراغ گل ہو گیا۔ فوقؔ دار پر کھینچے گئے کہ متوسلان دربار میں تھے۔ مولوی محمد باقر بھی شہیدِ فرنگ ہوئے کہ حیرت پسند صحافی اور بہادر شاہ کے ذاتی دوست تھے۔ محمد حسین آزادؔ بائیس نیم جانوں کو لے سجے سجائے گھر سے نکلے۔ سب کچھ چھوڑ دیا۔ لیکن استاد کے کلام کا ایک جنگ کلیجے سے لگائے رہے۔ شہروں شہروں مارے مارے پھرتے رہے مگر استاد کے کلام کو دم کے ساتھ رکھا۔

جب امی جمی ہوئی تو استاد کے دن رات کے حاضر باش شاگرد حافظ غلام رسول ویرانؔ، ظہیر دہلویؔ اور ان کے بھائی انور دہلویؔ نے استاد کے دیوان کی اشاعت کا بیڑہ اٹھایا۔ دیوان دلّی سے شائع ہوا۔ مگر سمندر سے ملی پیاسے کو شبنم۔ کلام کا بڑا حصہ ضائع ہو چکا تھا۔ پھر اس دیوان کی

اشاعت کے آٹھ برس بعد محمد حسین آزادؔ نے استاد کا دیوان شائع کیا اور اس اہتمام سے کہ جو کچھ ان کی کتابِ یادداشت میں مرقوم تھا اسے موقع محل کی مناسبت سے شامل کیا۔ جو جو چیزیں ان کے سامنے لکھی گئی تھیں، جس طرح لکھی گئی تھیں وہ سب ان کے حافظے میں محفوظ تھیں۔ آزادؔ نے انھیں جیتی جاگتی تصویروں کے قالب میں ڈھالا اور دیوان کو ایک زندہ اور متحرک نگار خانے کی حیثیت سے پیش کر دیا۔ اردو کے بعض محققوں اور ادبی تاریخ مرتب کرنے والوں کو آزادؔ کی اس کاوش پر اعتراض ہے لیکن آزادؔ کی اس کاوش کی بے اعتباری اردو ادب کی تاریخ کی بے اعتباری ہے۔ آج تک کسی شاعر کا دیوان ایسے مہکتے چہچہاتے گلدستے کی طرح نہ مرتب ہوا ہے نہ مرتب ہوگا مگر استاد کے کثرتِ کلام اور ریاضِ سخن کے حوالے سے یہ دیوان بھی محض ایک ورق ہے حکایاتِ رنگیں اور موجہ مشکیں کا۔ تاہم بقول استاد:

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ
اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت

دلدادگاہِ سخن اسی دیوان کو پڑھتے ہیں اور لطف حاصل کرتے ہیں استاد کی قادرالکلامی کی داد دیتے ہیں۔

استاد کی شعری پرداخت حافظ غلام رسول شوق کی سرپرستی میں ہوئی۔ شوق محض ملائے مکتب نہیں تھے۔ علوم رسمیہ سے پوری طرح آشنا تھے۔ اوسط درجے کے شاعر بھی تھے۔ اپنے عہد کی شعری روایت کے پابند تھے۔ لیکن ذوقؔ دیکھتے ہی دیکھتے مبتدیوں اور نومشقوں کے زمرے سے نکل کر اونچی اڑان بھرنے لگے۔ شاہ نصیر کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہوگئے۔ کاظم حسین بے قرارؔ کے ساتھ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اصلاح لینے لگے۔ شاہ صاحب، انشاءؔ اور مصحفیؔ کی روایتوں کے امین تھے، لکھنؤ بھی ہو آئے تھے۔ طرز و روشِ ناسخؔ سے واقف ہی نہیں لکھنؤ میں اس کا جلوہ بھی دکھا آئے تھے۔ ان کی شاعری میں برجستہ قافیوں کی منھ بولتی لگاوٹ۔ سنگلاخ زمینوں کی کساوٹ اور روزمرہ، محاورے اور ضرب الامثال کی آہٹ تھی۔ یہ اس عہد کا مذاق تھا۔ محاورہ اس طرح باندھا کہ شعر کا جزو بن جائے۔ روزمرہ سے شعر چست اور برجستہ ہو جائے۔ اس عہد میں شعری لسانیات تشکیلی دور سے گزر کر فارسی کی بالادستی سے آزاد ہو رہی

تھی۔ شاہ صاحب نے اس بالادستی کو ٹھکانے لگانے میں تاریخی کردار انجام دیا۔ تاہم ان کی طرز و روش معنی و مضمون کی اثر انگیزی کے بجائے خیال بندی سے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ایک چٹخارے کا احساس ہوتا ہے۔

خیالِ زلفِ دوتا میں نصیر پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

ہنسی سے ان کو دریا میں لگا بیٹھے جو ہم چھینٹا
تو منھ پر ہاتھ رکھ کر بولے لگتا ہے ستم چھینٹا

کہکشاں کشتی افلاک میں ایک لنگر ہے
کس طرح جائے یہ اے دیدہ تررات سے چھوٹ

خاک میں ناجنس رہتے ہیں نہ اہلِ امتیاز
اے فلک بنتی نہیں جاروبِ خس کی تیلیاں

اور یہ بوقت مے کشی کھل جانے کا نقطۂ آغاز:

ہے یہ تمنا میرے جی میں یوں تجھے دیکھوں بادہ کشی میں
ہاتھ میں ساغر بر میں مینا سر پر طرہ ہار گلے میں

شاہ صاحب استاد تھے۔ روشن پورے کے پیر لیکن ہمچو من دیگرے نیست کے حامل بھی تھے۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ دنیا طلب تھے۔ دکن جانے سے پہلے دربار سے وابستہ تھے۔ زر و گوہر کے رس کی تیلیاں انھیں دکن لے اُڑیں۔ واہ واہ تو بہت ہوئی مگر سوادِ اعظم سے کٹ گئے۔ ہر کس و ناکس سے فرمائش کرتے رہتے تھے۔ کاظم حسین بیقرارؔ دربار کے متوسلین میں تھے۔ امیر زادے تھے۔ ان کی غزل شاہ صاحب نے توجہ سے دیکھی۔ کیوں نہ دیکھتے صلے کی توقع تھی۔ ذوق بیچارے ادنیٰ درجے کے سپاہی زادے تھے۔ گھر میں فقط اللہ کا نور۔ استاد کی فرمائشیں کیسے پوری کرتے۔ ہاتھیوں سے گنے کیسے کھاتے۔ پھر یہ کہ ذوقؔ کی حیرت انگیز شعری صلاحیت میں انھیں اپنے فرزند دل پذیر وجیہ الدین منیرؔ کے ممکنہ مدِمقابل کی جھلک نظر آئی۔ اس لیے بے توجہی برتی، نظر انداز کیا۔ سودا کی غزل پر غزل اصلاح کے لیے پیش ہوئی تو اٹھا کر

پھینک دی اور پھر شاگرد سے دوبدو ہوتی رہی۔ آپ سے تم، تم سے تو ہوتی رہی۔

ذوقؔ نے اپنے کلام پر خود ہی اصلاحی نظر ڈالی۔ غزل ہنستی، مسکراتی، اپنے نئے روپ سروپ میں ان کے سامنے تھی۔ انھوں نے جلد ہی اہلِ سخن سے اپنی انفرادیت منوالی۔ نوجوانی میں ولی عہد بہادر کی غزل بنانے لگے۔ ولی عہد بہادر سے انھیں قلعہ معلی کی مستند زبان کا تحفہ ملا۔ ولی عہد کی غزل بناتے بناتے خود بن گئے۔ انھوں نے عہد کے رائج رنگِ سخن کو زیادہ برجستہ، زیادہ پر قوت، زیادہ پر کشش اور زیادہ مقبول بنا دیا، وہ اپنے عہد کا موئثر اظہار اور اپنے معاشرے کے طرزِ احساس کا سنگھار تھے۔ ذوقؔ کے یہاں ماضی کا تاسف، حال کی گراں جانی اور مستقبل کی پیش بینی نہیں ہے۔ لمحہ موجود ان کے لیے کوئی سوال ہی نہیں، آپ اپنا انعام ہے۔ انھوں نے بڑی دیدہ وری، ذکاوت اور شیدابیانی سے اپنی غزل کو ایک مہکتا ہوا خوش رنگ گلدستہ بنایا ہے۔ زبان ایسی خوشنما اور نظر فریب کہ قاری ایک لمحے کے لیے متحیر ہو جائے۔ سادہ سا مطلع ہے مگر زبان کی خوبی اور لفظوں کے باکمال استعمال نے جو گل کھلایا ہے، وہ دید کے قابل ہے۔

چنی تو نے افشاں جو اے مہ جبیں ہے
ستاروں میں کیا کیا چناں و چنیں ہے

چنی اور چناں و چنیں میں صورتی آہنگ کی دل کشی کے ساتھ ساتھ شاعر کا کمالِ فن بھی نمایاں ہے۔ ذوقؔ کے یہاں ایسے اشعار بہت ہیں۔

میں ہجر میں مرنے کے قریں ہو ہی چکا تھا
تم وقت پہ آپہنچے نہیں ہو ہی چکا تھا

"نہیں ہو چکا تھا" کا ٹکڑا قابل غور ہے۔ زبان کی یہ سادگی اور استادی ذوقؔ کی اہم خصوصیت ہے۔ یہ مطلع دیکھیے:

گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا
یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

محاورے کے ایسے بر محل استعمال سے ذہن چونک جاتا ہے۔ استادانہ فنکاری کا احساس ہوتا ہے۔ یہ چستی یہ برجستگی ذہن کو متحیر کر جاتی ہے۔ چند اور شعر دیکھئے، ٹھیٹ اردو کی روانی اور

شاعر کی شیدا بیانی کا آئینہ ہیں۔

کہنے نہ پائے اس سے ساری حقیقت اک دن
آدھی کبھی سنائی، آدھی کبھی سنائی
ستم دنیا کے جو جو تھے ستم گر دل پہ تھے گزرے
مگر صدمے ہماری جان پر ایسے نہ ہوتے تھے
دشمن جاں یک بیک سارا زمانہ ہوگیا
ہائے تاثیر محبت یہ ستم کیا ہوگیا
آنا تو خفا آنا جانا تو رلا جانا
آنا ہے تو کیا آنا جانا ہے تو کیا جانا

ذوقؔ کی قادر الکلامی اور شعری حکمت نے اپنے معاشرے کی عمومی سچائیوں کو شعر کے قالب میں ڈھال کر شعری ضرب الامثال کا مرقع بھی تیار کیا ہے۔ یہ عمومی سچائیاں ذوقؔ ہی کی معاشرے کی حقیقت پسندانہ فراست کا اظہار نہیں ہمارے عہد اور ہمارے مشاعرے کی آواز بھی ہیں۔

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو
زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو
نشہ دولت کا یہ اطوار کو جس آن چڑھا
سر پہ شیطان کے اک اور بھی شیطان چڑھا
نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا
سگِ دنیا پس مردن بھی دامن گیر دنیا ہے
کہ اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو
گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سرمارا تو کیا مارا

عمومی سچائیوں کے اس برملا اظہار نے ذوقؔ کو اردو شاعری کی تاریخ میں خاص مقام عطا کیا ہے۔ انھیں سنگلاخ زمینوں کو پانی کرنے، کڈھب قافیوں کو خوشنما پہلو سے بٹھانے میں ملکہ حاصل تھا۔ سادگی، روانی، عصری سچائی اور رموزِ محبت کے ظاہری پہلوؤں کی طلسم بندی ان کی شاعری کے نمایاں اوصاف ہیں۔

عام طور پر شعراء بڑی بحروں سے گریز کرتے ہیں۔ مصرعوں کی چستی اور روانی الفاظ کے انتخاب میں حشو وزوائد کو راہ دیتی ہے مگر ذوقؔ کے یہاں بڑی بحر کی غزلوں میں حیرت انگیز روانی اور الفاظ کی چستی نظر آتی ہے۔

جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے گر اس میں زلف سرکش ہو
پھر زلف بنے وہ دست موسیٰ جس میں اخگر آتش ہو
موئے سرمارانِ سیہ کا ایک سراسر لشکر ہے
مانگ جو ہے اک مارِ سفید اس لشکر کا سر لشکر ہے
گاہ ہجومِ یاس میں ہے دل گاہ ہجومِ حیرت میں
ہے یہ مرد سپاہی پیشہ پھر تا لشکر لشکر ہے
زمیں پہ نورِ قمر کے گرنے میں صاف اظہار روشنی ہے
کہ ہیں جو روشن ضمیر ان کا فروغ ان کا

روانی، موسیقیت، برمحل اور موزوں الفاظ، ٹھیٹھ اردو کا سجل لہجہ۔ کہیں شاعرانہ کاوش کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ حسنِ الفاظ اور حسنِ بندش کا دریا ابل رہا ہے۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں شعرائے دہلی کی درجہ بندی میں پہلا نام ذوقؔ کا، دوسرا نام مومنؔ کا، اور تیسرا غالبؔ کا تھا۔ استاد ذوقؔ کو اوّلیت استاد شاہؔ اور عصری نغمہ خواں ہونے کی وجہ سے حاصل تھی۔ مومنؔ معاملہ بندی لمسیاتی حسیت اور عاشقانہ بوالہوسی کے شاعر تھے۔ غالبؔ عندلیب گلشن نا آفریدہ تھے۔ ان کے عرفانِ ہنر کا ماحول پوری طرح واضح نہیں ہوا تھا۔ مومن بھی ذوقؔ کی طرح شاہ نصیر کے باغی شاگرد تھے۔ ذوقؔ مومنؔ اور غالبؔ تینوں کا اندازِ سخن ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھا۔ بقول بہادر شاہ ظفرؔ:

پھول چمن میں ہیں ہزار دیکھ ظفر ہے کیا بہار
سب کا ہے رنگ الگ الگ سب کی ہے بو جدا جدا

تینوں میں میل ملاقات بھی تھی۔ چشمک بھی تھی، دادو تحسین بھی تھی۔ غالبؔ نے جب ذوقؔ کا یہ شعر سنا:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

تو بے تاب ہوگئے تھے۔ بہادر شاہ ظفرؔ اس دور کی اہم ترین شخصیت تھے۔ عصری چشمکوں اور شعری درجہ بندی سے بالاتر تھے۔ انھوں نے ذوقؔ اور غالبؔ دونوں کی سرپرستی کی تھی۔ وہ اس زمرے میں نہیں آتے۔ ویسے بھی کلام الملوک ملوک الکلام۔

ذوق کی غزل کے مطالعے میں دو پہلو اور بھی قابلِ توجہ ہیں۔ انگریزی کے مابعد الطبیعاتی شعر کی طرح ہلکی سی انانیت، دوسرے خود ان کا تصورِ جمال۔ ان کے تصورِ جمال کے پس منظر میں شعری روایت کے حسن مرکب سے علاحدہ ایک سیدھی سادی گھریلو عورت کا بھولا بھلا اور معصوم چہرا ابھرتا ہے۔

اللہ رے تاب حسن کہ اس کا درِ بلاق
چشمک زنی کرے ہے سہیل یمن کے ساتھ
آکے غرفے میں نہ بیٹھے تو نہ بیٹھے وہ شوخ
روزن در سے ذرا آنکھ لڑائے تو سہی
ہے غضب سرمے نے چمکایا تری آنکھوں کو
آج فتنہ ہمیں بیدار نظر آتا ہے
جب سے پڑا ہے باغ میں جھولا ترے لیے
ممنون باغ میں ہے نہایت رسن کی شاخ
ہم ان کی چال سے پہچان لیں گے ان کو برقعے میں
ہزار اپنے کو وہ ہم سے چھپائیں سر سے پانو تک

یہ تصور معاشرے کا عمومی تصور و تاثر جمال ہے، اس میں ذوقِ نظر ہے، لذتِ احساس ہے استہزار رومانی کا اس سے کوئی علاقہ نہیں ہے، نہ اس کی کوئی گنجائش ہے۔

استاد ذوقؔ ایک طویل عرصے تک دربار سے وابستہ رہے۔ اکبر شاہ ثانی کی مدح میں بھی قصیدے لکھے، بہادر شاہ ثانی کی بھی مدح سرائی کی۔ مگر قصیدوں کی تعداد بہت کم ہے۔ بیشتر قصیدے دست بردِ زمانہ سے ضائع ہوگئے۔ جو بچ گئے ان کی وجہ سے وہ اردو قصیدہ گوئی میں مرزا رفیع سوداؔ کی طرح نہایت اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔ استاد ذوقؔ کے قصیدے ان کی غزل کی طرح روانی اور دلکشی کے حامل تو ہیں ہی۔ اس پر اضافہ کیجئے، ترنم، موسیقیت، علمی تبحر اور شوکت الفاظ و مضامین کا۔ ذوقؔ کے قصیدے کمال فن کا آئینہ ہیں۔ مرزا سوداؔ کا ایک بڑا مشہور قصیدہ ہے۔

اٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستان سے عمل
تیغ اردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل

ذوقؔ نے اس مطلعے کی چمن بندی کو ذہن میں رکھ کر اپنے ایک بڑے مشہور قصیدے کے مطلعے کو اسی انداز سے رقم کیا ہے۔

جب کہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن
آب وایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

آفتاب کا برج سرطان واسد میں قیام، آب وایلولہ کے مہینوں کی دھوم دھام، بہار کی بے ساختگی اور طراوت کا التزام۔ استاد نے علمی عمق کو بھی مد نظر رکھا ہے اور اپنی خصوصی روانی کا اہتمام بھی کیا ہے۔ افسوس کہ یہ قصیدہ نابود ہوگیا، صرف تین شعر باقی رہ گئے۔

قصیدے کیا استاد کے کلام کا بڑا حصہ نابود ہوگیا۔ جو رہ گیا ہے کیا قصیدہ اور کیا غزل وہی سرمہ اہلِ نظر ہے۔

ہم تبرک ہیں بس اب کرلے زیارت مجنوں
سر پہ پھر تالیے آبلہ پا ہم کو

استاد جوانی میں عاشقانہ، گرما گرم اور نمکین شعر کہتے تھے۔

جھمکے ہے ترے ماتھے پہ جھومر کا پڑا چاند
لابوسہ چڑھے چاند کا وعدہ تھا چڑھا چاند

رفتار وہ کہ فتنہ رہے سو قدم پرے
قامت کہے ہے شورِ قیامت کو تھم پرے

لکھوا کے بھیج دیتا ہے اک پرچہ گاہ گاہ
دل کوندا مرے پرچائے جائے ہے

ذکر حسن شمع لانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
ان کو در پردہ جلانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

عبث تم اپنی رکاوٹ سے منہ بناتے ہو
وہ آئی لب پہ ہنسی دیکھ مسکراتے ہو

چڑھے چاند کا قصہ یہ ہے کہ ایک دن محمد حسین آزاد نے اپنے مطبع میں سنا کہ رات فلاں بازار میں سورج مکھی پر استاد ذوقؔ کے نوکر نے بھی شعر پڑھے۔ شام کو جب وہ استاد کے یہاں گئے تو ذوقؔ زنان خانے میں تھے۔ انھوں نے محمد بخش سے پوچھا "رات تم نے کیا شعر پڑھے تھے؟" وہ مکر گیا۔ بڑی مشکل سے یہ مطلع سنایا، پھر کہا "یہ تو اب شعر کہنا بھول گئے"۔ آزادؔ نے پوچھا "کون؟" بولا "یہی میاں ابراہیم۔ پہلے اچھے شعر کہتے تھے اب تو کچھ اور ڈھب کے کہتے ہیں" اس کچھ اور ہی ڈھب کے سادہ سے جملے میں استادؔ ذوق کے ذہنی ارتقاء کی پوری تفصیل پنہاں ہے۔ پہلے عاشقانہ کہتے تھے۔ جوانی گزری تو زبان، بذلہ سنجی، ہلکی سی شوخی کا اظہار ہوا۔ عوامی سچائیاں نمایاں ہوئیں اور آخر آخر میں:

معلوم جو ہوتا ہمیں انجام محبت
لیتے نہ کبھی بھول کے ہم نام محبت

واں سے یاں آئے تھے اے ذوقؔ تو کیا لائے تھے
یاں سے جائیں گے تو ہم لاکھ تمنا لے کر

ہمارے کعبۂ دل میں ہمیشہ روشن ہے

کسی کے باب کمال ظہور کی قندیل

احسان ناخدا کے اٹھائے مری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

استاد کے یہاں خوب سے خوب تر کی تلاش کے نقوش بہت واضح ہیں لیکن ایک بات یہ بھی قابل غور ہے کہ ان کے یہاں مضامین اور خیالات کی رکاکت اور ابتذال کے اثرات کم سے کم ہیں۔ شعری روایت کی پابندی ایک مجبوری تھی۔ تاہم یہ بھی واضح ہے کہ ان کا ذوق شعری "اُدھر آتا نظر نہیں آتا۔"

انھوں نے عام طور پر ہلکے پھلکے مزاح، شگفتگی اور متانت کو ملحوظ رکھا ہے۔ انھوں نے اپنا مسلک بڑے حسن اور سلیقے سے اپنے مطلع میں بیان کیا ہے:

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
ان کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

اور پھر دن رات کا یہ کھٹکا۔

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

یہ کھٹکا رسمی اور مصنوعی نہیں۔ استاد کے دل کی آواز ہے۔

استاد اجلے آدمی تھے۔ صاف ادھر سے نظر آتا ہے ادھر کا پہلو۔ سفید لباس پہنتے تھے۔ داغ دھبہ گوارا نہیں کرتے تھے۔ تیز تیز چلتے تھے۔ ساری زندگی کچھ تیزم تازی اور کچھ عام تیزی میں گزر گئی، مدح کرتے تھے، دعا دیتے تھے۔ فرقت نہیں کرتے تھے۔ پھر بھی وضو کے بعد ایک لوٹے پانی سے بھر بھر کلیاں کرتے رہتے تھے۔ محمد حسین آزادؔ بچپن میں انھیں اس طرح کلیاں کرتے دیکھتے تو ہنستے تھے۔ بڑے ہو گئے تو ایک دن پوچھ لیا، کیا سبب ہے۔ استاد نے کہا "دیکھتے ہو زبان سے کیا کیا نکل جاتا ہے؟ خیر یہ بھی ایک بات ہے"۔ پھر ذرا تامل کے بعد یہ مطلع برجستہ پڑھا:

پاک رکھ اپنا دہاں ذکر خدائے پاک سے
کم نہیں ہرگز زبان منھ میں ترے مسواک سے

اخلاقیات کی یہ تلقین بڑی واضح ہے۔ پروفیسر فراق گورکھپوری کے بقول "ذوق کی اخلاقیات کو مرتب کر کے ایک پورا سسٹم بنایا جاسکتا ہے۔"

درخت اپنے پھل سے، اور استاد اپنے شاگردوں سے پہچانا جاتا ہے۔ استاد کی تربیت گاہِ سخن سے بے شمار تلامذہ نے استفادہ کیا۔ اردو ادب کے نئے باب رقم کیے اور استاد کا نام روشن کیا۔ استاد کو بذات خود ایک بے درد استاد سے پالا پڑا تھا۔ اس لیے وہ شاگردوں کا درد سمجھتے تھے۔ شفقت برتتے تھے، اپنا رنگ نہیں ٹھونستے تھے۔ شاگرد کی صلاحیت اور استعداد کے مطابق اصلاح دیتے تھے۔ اس کی انفرادیت کو مجروح نہیں کرتے تھے۔ ان کے تلامذہ میں سب سے اول بہادر شاہ ظفرؔ تھے۔ طرزِ خاص اور لال قلعے کی زبان کے فرماں روا۔ استاد کے بارے میں کس محبت سے کہا:

تیرا مذاقِ شعر ظفرؔ جانتا ہے کون
استاد ذوقؔ تھا ترے واقف مذاق سے

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ استاد کی محبت ہی کا اظہار نہیں استاد ثانی پر چھینٹا بھی ہے۔

نواب مرزا خان داغؔ استاد کے وہ ممتاز شاگرد تھے جنھوں نے استاد کی سادگی اور روانی میں عشوے، چونچلے اور عشق کے ظاہری انداز کو نمایاں کر کے عوامی جذبات کو زبان دے دی ہے۔

تھی زبانِ داغؔ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
لیلیٰ معنی یہاں بے پردہ واں محمل میں ہے

داغ کے حوالے سے استاد کا سلسلہ اقبالؔ تک پہنچا اور اردو شاعری نے بلندی پر ایک منظر تعمیر کر لیا۔ داغؔ، "فصیح الملک، جہاں استاد، بلبلِ ہندوستان" کہلائے، جب تک زندہ رہے عشاق کے دلوں پر حکمرانی کرتے رہے، آج بھی ان کے اشعار عام و خاص سب کی زبانوں پر ہیں۔ استاد کے دوسرے نامور شاگرد ظہیر دہلوی کا تعلق دلّی کے مشہور خوش نویسوں کے خاندان سے تھا۔ بہادر شاہ ظفرؔ خوش نویسی میں ان کے والد کے شاگرد تھے۔ ظہیر ۱۸۵۷ء تک دربار شاہی میں خدمت انجام دیتے رہے۔ غدر نے انھیں بڑا خوار کیا۔ پھر الور اور جے پور کی ریاستوں میں خوش باش رہے۔ آخر آخر میں حیدر آباد دکن چلے گئے اور وہیں کی خاک کا پیوند ہوئے، ظہیرؔ طرزِ

مومنؔ کے دلدادہ تھے۔

طرز مومن سے نہ آگاہ تھے جب تک کہ ظہیرؔ
سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا

استاد نے بھی انھیں طرزِ مومنؔ ہی میں اصلاح دی۔ پہلے طرزِ استاد میں ظہیرؔ کا رنگ دیکھیے:

بہت معمورۂ ہستی میں اجڑے گھر نکلتے ہیں
جہاں کھودو وہیں بنیاد کے پتھر نکلتے ہیں
فلک سے موت گر مانگوں تو عمرِ خضر ملتی ہے
یہ کج رفتار جب چلتا ہے الٹی چال چلتا ہے

اور استاد کی شفقت کا یہ برملا اظہار:

ہے جو یہ حسنِ بیاں میرے سخن میں اے ظہیرؔ
یہ مجھے فیضانِ صحبت ہے مرے استاد کا

رنگ مومن کے اثرات:

اعجازِ دلفریبی انداز دیکھنا
ہر ہر ادا پہ مجھ کو گمانِ نظر رہا
ہزار شکر کہ ہم سا ہی نابلد نکلا
سلام کرکے قدم ہم نے رہ نما کے لیے
اس بزم میں جاتے ہی مرے پڑگئی ہلچل
رنگِ رخِ اعدا میں ہے پروانے کا انداز
آنکھوں سے ٹپکتی ہے سیہ مستی دوشیں
کہنے کو ہے کچھ غمزہ غماز کا انداز

ظہیرؔ قصیدے اور مرثیے میں بھی بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کے گم شدہ مراثی کا ایک مجموعہ ''اوراقِ کربلا'' کے نام سے اقبال کاظمی نے کراچی سے شائع کیا ہے مگر وہ بدنصیب تھے۔

جو شہرت انھیں ملنا چاہیے تھی نہیں ملی۔ ظہیرؔ نے استاد کے ایک اور شاگرد حافظ ویراں کے ساتھ مل کر استاد کا دیوان شائع کیا تھا۔

حافظ ویران استاد کے خاص شاگرد تھے اور ہر وقت حاضر باش تھے۔ ان کی بصارت بصیرت میں منتقل ہوچکی تھی۔ استاد کے ایسے عاشق زار تھے کہ ادھر کسی نے استاد کے بارے میں کوئی ناروا بات کہی، اور انھوں نے اس کے خاندان بھر کو تو م ڈالا۔ استاد کا سارا کلام نوک زبان تھا۔ آزادؔ نے دیوانِ ذوقؔ کی ترتیب میں حافظ ویران کی معلومات سے استفادہ کیا ہے اور اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ ویرانؔ کا تعلق بھی دربارِ شاہی سے تھا۔ تہنیتی قطعے اور قصائد پیش کرتے تھے۔ دلّی میں خواجہ باقی باللہ میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ مزار پر انھیں کا شعر کتبے میں درج ہے اور ان کے تخلص کی معنویت کا شاہد ہے۔

فاتحہ مرقدِ ویراں پہ بھی پڑھتے جائیں
ان سے کہہ دو جو ہیں اس رہ سے گزرنے والے

استاد کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ظفرؔ، داغؔ، ظہیرؔ، اور ویرانؔ کے علاوہ استاد کے جس شاگرد نے استاد کی فکر اور ان کے فن کو روشن کیا وہ محمد حسین آزادؔ ہیں۔ حافظ ویرانؔ اگر عاشق ذوقؔ تھے تو آزادؔ کو استاد کا کشتۂ محبت سمجھنا چاہیے۔ بیس برس تک استاد کی حضوری اس طرح حاصل رہی کہ ہر چھٹّی کا دن انھیں کے ساتھ گزرتا تھا۔ ان کے حالات، واقعات، لطائف رموز و نکات۔ آزادؔ کو سب یاد تھے۔ یاد کیا تھے دل پر نقش تھے۔ اردو شاعری کی اولین تاریخ "آبِ حیات" میں استاد کا تذکرہ بڑی محبت اور سرشاری کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ دیوانِ ذوقؔ کو اس طرح مرتب کیا کہ کلام کی توقیت اور شان نزول بھی واضح ہوگئی۔ عقیدت، محبت، شیفتگی اور احوال واقعی کے ایسے دل فریب نقشے کہیں اور نظر نہیں آتے۔ استاد سے آزاد کی محبت کا یہ عالم تھا کہ اپنے اکلوتے بیٹے کا نام استاد کے نام پر رکھا۔ آزادؔ کے فرزندِ ارجمند کا نام بھی محمد ابراہیم تھا۔ یہ عقیدت کی انتہا ہے۔

آزادؔ نے شاعری میں بھی استاد سے بہت استفادہ کیا لیکن انھیں مملکتِ نثر کی شاہی عطا ہوئی تھی۔ وہ اردو نثر کے سب سے بڑے انشاء پرداز ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ انھیں یہ افتخار

بھی حاصل ہے کہ وہ اردو ادب میں جدید شاعری کے بانی ہیں، اردو نظم کا رواج انھیں کی کوششوں سے ہوا۔ ان کی نظمیں پرزور اور دلکش ہیں، آزادؔ کے ذریعے سے دبستانِ ذوقؔ ہی اردو نظم کا بانی مبانی قرار پایا۔ ایک طرف داغؔ اور اقبالؔ اور دوسری طرف آزادؔ اور نظم جدید کے شعراء۔
"راستے جو بھی ہیں وہ سب مرے گھر سے نکلے۔"

اردو شاعری میں اور کسی استاد کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا۔

استاد کے اصلاح دینے کا طریقہ سیدھا اور صاف تھا۔ شام کو شاگرد جمع ہوتے اپنی اپنی غزلیں پیش کرتے جاتے۔ استاد اصلاح دیتے جاتے۔ کہیں کوئی لفظ بدلا۔ کہیں زبان و بیان کی طرف توجہ دلائی۔ شاگردوں کا دل بڑھاتے تھے۔ حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ایک شام داغ نے غزل پیش کی۔ مطلع پڑھا:

زندہ عیسیٰ کا نام کرنا تھا
اس طرف بھی خرام کرنا تھا

استاد بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے "نواب مرزا یہ کلام تمہیں زندہ رکھے گا"، داغ نے پہلا شعر پڑھا:

نہیں اٹھتا ستم تو حضرتِ دل
عاشقی کو سلام کرنا تھا

استاد نے کہا، "یہ کچھ نہیں، شعر اصلاح طلب ہے"۔ استاد شاگرد دونوں نہر کنارے ٹہل رہے تھے۔ اچانک شاہی چوب دار حاضری کی اطلاع لے کر آپہنچا۔ استاد قلعہ معلی چلے گئے۔

دوسرے دن استاد نے کہا ہاں تو مرزا وہ کیا شعر تھا۔ داغ نے پڑھا:

نہیں اٹھتا ستم تو حضرت دل
عاشقی کو سلام کرنا تھا

استاد نے کہا اسے یوں کرلو۔

تھی نہ تابِ ستم تو حضرتِ دل
عاشقی کو سلام کرنا تھا

نکاتِ سخن سے ناواقف حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ فارسی ترکیب سے مصرعے میں چستی کے علاوہ اور کیا فرق ہوا۔ جواب یہ ہے کہ زبان اور محاورے کے ماہر قادر الکلام استاد نے پہلے مصرعہ کے ابتدائی دو لفظوں کے مجموعے کی رکاکت اور لغاتِ بازاری کی کثافت کو محسوس کر لیا تھا۔ انھوں نے شاگرد کے کلام کو پہلوئے ذم سے پاک کر دیا۔

استاد کی صحت اچھی تھی لیکن پیچش اور بواسیر کی تکلیف رہتی تھی۔ اڑسٹھ برس کی عمر ہو گئی تھی۔ تیرہ تیزی کا مہینہ تیزی سے گزر رہا تھا کہ بخار آنے لگا۔ پیچش اور بواسیر نے بھی اپنا رنگ دکھایا۔ بخار اتر گیا مگر پیچش اور بواسیر میں افاقہ نہ ہوا۔ نقاہت بڑھتی چلی گئی۔ ۲۳ تاریخ کی شام کو آزادؔ، حافظ ویرانؔ اور خلیفہ محمد اسمٰعیل حاضر تھے۔ استاد کو پیشاب کی حاجت ہوئی۔ خلیفہ محمد اسمعیل نے اٹھایا۔ چوکی پائنتی لگی ہوئی تھی ہاتھ کا سہارا دیا اور استاد نے کھسک کر آگے بڑھنا چاہا۔ طاقت نے یاوری نہ دی تو کہا، "آہ ناتوانی" خلیفہ محمد اسمٰعیل نے کہا شاعروں ہی کا ضعف ہو گیا۔ حافظ ویرانؔ بولے، "آپ نے بھی ضعف کے بڑے بڑے مضمون باندھے ہیں۔" استاد نے مسکرا کر کہا، "اب تو کچھ اس سے بھی زیادہ ہے"۔ آزاد بولے "سبحان اللہ۔ اس عالم میں بھی مبالغہ قائم ہے۔" صبح ہوتے ہوتے جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔ انتقال سے تین گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا۔

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گزر گیا
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

جنازے میں شہزادے بھی تھے۔ شاعر بھی تھے۔ عالم بھی تھے۔ دربار دار بھی تھے۔ عام آدمی بھی تھے۔ ساری دلّی امنڈ آئی تھی۔ قدم شریف کے پاس کلو کے تکیے والا قبرستان تھا وہیں رکھے گئے۔ استاد ذوقؔ ہر جمعرات کو زیارت کے لیے قدم شریف جاتے تھے۔ یہ گلیاں انھیں بہت پسند تھیں، وصیت کر دی تھی کہ "مجھے قدم شریف کے قریب گورِ غریباں مین دفن کیا جائے۔" اسی پر عمل ہوا۔

حضور پر نور کو بڑا ملال ہوا۔ کم و بیش نصف صدی کی محبت تھی۔ فوراً استانی کو ماتمی خلعت بھجوایا۔ روایت یہ بھی ہے کہ جہاں پناہ خلیفہ محمد اسمعیل کو گلے لگا کر بہت روئے۔ بیگم زینت محل

نے بھی ماں بیٹے دونوں کی تشفی فرمائی۔ جہاں پناہ نے مقبرے کی تعمیر کا حکم بھی دیا اور استاد کی تاریخ وفات کہی۔

شبِ چار شنبہ بہ ماہِ صفر
بہ حکم خداوند جاں داد ذوقؔ
ظفرؔ روئے اردو بہ تا خونِ غم
فراشید و فرمود "استاد ذوق"

۱۲۷۱ھ

مرزا غالب نے بھی تاریخ کہی:

تاریخ وفاتِ ذوق غالب
باخاطر دردمند و مایوس
خون شد دل زار تا نوشتم
خاقانی ہند مُرد افسوس

دوسری تاریخ میں غالب نے ذوق کو "گوہر گراں" سے تعبیر کیا ہے:

گویند ذوق رفت ز دنیا ستم بود
کاں گوہر گراں بہ تہہ خشتِ گِل نہند
تاریخ فوت شیخ بود "ذوق جنتی"

"بر قول من رواست کہ احباب دل نہند" احباب نے غالب کے اس قول کی ضرور تحسین کی ہوگی۔

استاد کا نام اور کلام ان کے بعد بھی سکہ رائج الوقت رہا۔ اردو کی تمام نصابی کتابوں میں ان کا کلام شامل ہوا۔ آج بھی ہے۔ آل انڈیا ریڈیو دلی نے اپنے ابتدائی دور میں اردو کے مقتدر شعراء کی یاد میں سالانہ مشاعرے منعقد کیے تھے۔ استاد کے حوالہ سے مشاعرہ ۱۹۳۷ء میں نشر ہوا تھا۔ اس پروگرام میں پروفیسر فراقؔ گورکھپوری نے اپنے اس عالمانہ مقابلے کا ابتدائیہ پڑھا تھا جس میں تنقید تخلیق کا رنگ اختیار کر گئی ہے۔ یہاں شاہ ظفر کے حوالے سے بھی مشاعرہ ہوا تھا۔ "یا تو

افسر مراشاہانہ بنایا ہوتا" طرح تھی۔

استاد کو اردو شاعری کا ستون تو سمجھا گیا لیکن ان کے انتقال کو ایک صدی بھی نہیں گزری تھی کہ ان کا مزار بے نشاں ہی نہیں عوامی بیت الخلاء کا حصہ بن گیا۔

وفورِ بادہ پرستی ہُوا یہ عالم میں
کہ قصرِ ذوقؔ بھی آخر شراب خانہ ہوا

بڑی لے دے ہوئی لیکن "صدا طوطی کی سنتا کون ہے نقار خانے میں۔" آخر دلّی کے درمند ذوقؔ شناسوں نے ایک کمیٹی بنائی۔ انجمن ترقی اردو کے سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم اس کے کرتادھرتا قرار پائے۔ مزار کی بحالی کی تحریک شروع ہوگئی۔ میونسپل کارپوریشن کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ کارپوریشن نے بڑی ڈھٹائی سے آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے کہہ دیا، "اس جگہ کوئی مزار وزار نہیں ہے"۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ مگر جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔ ایک ادب دوست نے ہندوستانی اخبار انڈین ایکسپریس میں مزار ذوقؔ کی بحالی کے لیے ایک نوٹ شائع کیا۔ اس پر عدالت عالیہ کے ایک نامور وکیل نے محکمہ آثار قدیمہ اور دلّی میونسپل کارپوریشن کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ اس مقدمہ میں انجمن ترقی اردو اور غالب انسٹی ٹیوٹ بھی فریق بن گئے مگر عدالتی کارروائی ہو تو کیسے۔ وکیل صاحب نے مقدمہ کے لیے تین لاکھ محنتانہ طلب کیا۔ یہاں "چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں،" استاد کی دستار فضیلت بھی باقی نہیں رہی تھی۔

میکدے میں رات اک پگڑی ہوئی تھی گروی
ذوقؔ وہ تیری ہی دستار فضیلت ہو تو ہو

ڈاکٹر خلیق انجم نے اللہ کا نام لے کر خود ہی پیروی کی۔ خود ہی بحث کی۔ اور عدالت عالیہ نے ان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ استاد کا مزار بھی بحال ہوگیا۔ شایان شان یادگار بھی تعمیر ہوگئی۔ اب ہر سال استاد کے یوم وفات پر مزار پر گل پاشی بھی ہوتی ہے۔ سیمینار بھی منعقد ہوتا ہے۔ یہ آواز کبھی آتی ہے۔

سرشکِ چشم مرے ہیں کہ ہوگئے موزوں
مری طرح سے کوئی ذوق شعر تر تو کہے

استاد ذوقؔ گذر گئے، کلام رہ گیا۔ نام رہ گیا۔ ساری زندگی آبیاری سخن میں گزاری۔ خاکساری اور فروتنی میں گزاری۔ نہ کسی سے بل کی لی، نہ کسی کی پگڑی اچھالی۔ ہر کسی سے عاجزانہ کلام کرتے رہے۔ سب کو خود سے بڑا سمجھتے رہے۔

اے ذوقؔ کس کو چشمِ حقارت سے دیکھیے
سب ہم سے ہیں زیادہ کوئی ہم سے کم نہیں

زیادہ اور کم ہونے کا فیصلہ ادب کی تاریخوں میں لکھا ہوا ہے۔